ماہنامہ
مارچ 2024ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ





بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
مارچ 2024ء

جلد 77 شمارہ نمبر 3

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
کہاں میں کہاں، یہ مقام، اللہ اللہ!	پرویزؒ	6
درسِ قرآن (سورۃ البقرۃ، آیات 228 تا 233)	پرویز علیہ الرحمۃ	24
روزوں کا مقصود و منتہیٰ	غلام احمد پرویزؒ	47
محشرستانِ فلسطینؔ (گذشتہ سے پیوستہ)	ادارہ	54
علامہ پرویزؒ کی آخری اپیل	ادارہ	61
سپاسنامہ بخدمت قائداعظم محمد علی جناحؒ	ادارہ	62

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
اب میری ضرورت نہیں باقی تہہِ افلاک[1]

یورپ نے ''جمہوری تماشا'' کا جھنجناد ے کر اقوامِ عالم کو عجیب قسم کا اضحوکہ بنا رکھا ہے۔ جمہوریت کے متعلق فریب یہ دیا جاتا ہے کہ اس میں اقتدار اور اختیار عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے حالانکہ یہ اختیار اس وقت تک ہوتا ہے جب تک ''ووٹ کی پرچی'' اس شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جونہی اس نے وہ پرچی ''ڈبے'' میں ڈالی اس کے اختیار و اقتدار کی حدود ختم ہوگئیں۔ اس کے بعد تمام اختیار و اقتدار بظاہر اس شخص کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جو ان پرچیوں کی رُو سے منتخب ہوجاتا ہے۔ یہ منتخب ہونے والا دوسرے الیکشن تک اسی قسم کا آمر ہوتا ہے جیسے دنیا کے اور ڈکٹیٹر۔ البتہ اسے راگ یہ الاپنا پڑتا ہے کہ اختیار اس کے ہاتھ میں نہیں عوام کے ہاتھ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس نام نہاد جمہوریت میں سیاست کا اصل مقصود حصولِ اقتدار ہوتا ہے یا گروہی مفادات کا تحفظ۔ پیشہ ور سیاستدان ایوانِ حکومت میں در آتے ہیں' نکال دیئے جاتے ہیں۔ حکومتیں بدلتی ہیں' حکمران بدلتے ہیں۔ ہر حکمران نئے دعوؤں اور جدید نعروں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ مسندِ حکومت پر ہیں تو سب کچھ کر گزرنا روا۔ اور ایوانِ حکومت سے نکالے گئے یا وہاں تک نہیں پہنچ پائے تو حکومت کے خوب کو ناخوب کہنا اور اس کے محاسن کو معائب کا نام دینا فرض قرار پاجاتا ہے۔

جہاں تک جمہوریت کے عملی تجربہ کا تعلق ہے' پچھلے 77 برس سے ہم اسی کی بھینٹ چڑھے ہوئے ہیں۔ ملکی معاملات میں نت نئے تجربات' معاشرے کی چیخ پکار' قوم کی زبوں حالی' قدم قدم پر زندگی کی ہڈیاں چٹخنے کی دردانگیز آہیں' ارباب بست وکشاد کے اپنے اعلانات کہ ہمارے ہاں رشوت' بددیانتی' نالائقی' اقربا پروری' انفرادی مفاد پرستی کی لعنت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ہم حکمرانوں کے ایک گروہ سے تنگ آ کر انتخاب کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن نئے انتخابات کے بعد انہی جیسا ایک اور گروہ ہم پر مسلط ہوجاتا ہے۔ ہمارے وہ رہنما جو ایوانِ حکومت تک نہیں پہنچ پاتے پھر عوام کے پاس پہنچ جاتے ہیں کہ ٹرین ہم نے چلادی ہے۔ تھوڑا سا دھکا اور لگادیں اور یوں سمجھ لیں کہ اقتدار آپ کے قدموں میں ہے۔ عوام کا تعاون انہیں بھی میسر تھا' عوام

[1] ''ابلیس کی عرض داشت''۔ بالِ جبریل۔ علامہ اقبالؒ

ان کے بھی ساتھ ہیں لیکن ''سیاسی جدوجہد'' نہ اس وقت کسی نظام کے حق میں تھی نہ آج کسی نظام کے خلاف ہے۔ تب بھی شخصیات کے خلاف تھی اب بھی شخصیات ہی کے خلاف۔ نظر یوں آتا ہے کہ ملک کی بساط سیاست پر چند شاطر بیٹھے ہیں جو جوڑ توڑ اور ہار جیت میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے موجودہ نظامِ سیاست میں اساسی خرابیوں کے علاوہ ان ہی اربابِ ہوس کی ریشہ دوانیوں کا بھی نتیجہ ہے۔ حیرت ہے کہ چپڑاسی کی ایک معمولی سی آسامی کے لئے تو معیار مقرر ہے لیکن ہماری پارلیمان یا سینٹ کے اراکین کے لئے کوئی بنیادی معیار مقرر نہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کاش ہم لوگوں نے قرآن سمجھ کر پڑھا ہوتا۔

طلوعِ اسلام اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہے۔ جس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں تاہم حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر یہ مشورہ ہم سیاسی راہنماؤں کو ضرور دینا چاہیں گے کہ:

روپے اور پراپیگنڈہ کے زور پر ہنگامہ آرائیاں برپا کر کے دوسروں کو مرعوب تو کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی روش اور اس قسم کی ذہنیت کے حصہ میں بقا نہیں ہوتی۔ خدا کا اٹل قانون ہے کہ یہاں بقا اسی کو نصیب ہو سکتی ہے، جو اس پروگرام کو لے کر اُٹھے جو اقدارِ سماوی (قرآنِ کریم کے بنیادی آئین) کے مطابق عام انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) اس لئے یہاں بھی آخر الامر بقاء اسی کی ہوگی جو سیاسی فرقہ واریت سے بلند ہو کر قرآن کے نظامِ ربوبیت کو لیکر اُٹھے گا۔ جھکڑ اور آندھیاں درختوں کو جڑ سے اکھیڑ سکتی ہیں مگر لہلہاتی کھیتیاں پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو جماعت اس راز کو پالے گی وہی نوعِ انسانی کی نفع بخشیوں کا ذریعہ بنے گی اور ثبات و بقا اسی کے حصہ میں آئے گی۔

سیاسی جماعتیں جب ملکی اور قومی مفادِ عامہ کی بجائے اپنے مطالبات کو سامنے رکھیں گی تو حکومتیں کیسے مصلحتوں کا شکار نہیں ہُوں گی۔ موجودہ حالات میں بہتر تو یہی تھا کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھا جاتا اور سیاسی فرقہ بندی چھوڑ کر ایک وسیع البنیاد متفقہ اور متحدہ حکومت تشکیل پاتی جس کا مطمحِ نظر صرف اور صرف ''ما ینفع الناس'' ہوتا ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی بجائے سب کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے۔ ملک کو اس بحران سے نکالنے کی کوشش کی جاتی۔ اب بھی وقت ہے کہ ڈھلوان کے سفر کو روکنے کی کوشش کی جائے۔ یہ عہدوں پر لڑنے جھگڑنے کا وقت نہیں ہے بلکہ سیاسی فرقہ بازی چھوڑ کر، جسے قرآن نے شرک سے تعبیر کیا ہے، ملکی اور قومی مفادات کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔ یہ ہمارے اربابِ سیاست کا امتحان ہے۔

سانحہ ارتحال

محترم بشیر عابد ٹرسٹی، طلوعِ اسلام ٹرسٹ گذشتہ ماہ وفات پا گئے۔ مرحوم کی فکرِ قرآنی کی توسیع و تعارف کے سلسلہ میں خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ ادارہ لواحقین و اعزہ اقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادب گاہیست زیرِ آسماں، از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

کہاں میں کہاں یہ مقام، اللہ اللہ!

جب سے میرے شعور نے آنکھ کھولی، ایک نہایت حسین و تابناک آرزو کو دل کی گہرائیوں میں مچلتے، انگڑائیاں لیتے پایا۔ یعنی ارضِ حجاز کی خاک بوسی کی آرزو۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، یہ آرزو جوان سے جوان تر ہوتی چلی گئی۔ اس دوران میں میں نے اس ارضِ مقدس کے کوہساروں، صحراؤں، وادیوں، میدانوں، گلیوں، کوچوں اور رشکِ صد طور جلوہ گاہوں سے متعلق ہزار ہا صفحات لکھے ___ جگر کے گداز، دل کے سوز اور آنکھوں کی شبنم فشانیوں کے ساتھ لکھے، لیکن یہ سب میرے تخیلاتی یا مطالعاتی نقوش پر مبنی تھے ___ اور تصوراتی اور مشاہداتی نقوش میں جو فرق ہوتا ہے، ظاہر ہے۔ جوں جوں میں لکھتا جاتا تھا، تکرارِ موسویؑ کی طرح شوقِ دید تیز تر ہوتا جاتا تھا، لیکن اس کی تسکین کا کوئی سامان مہیا نہیں ہوتا تھا۔ چند سال اُدھر سے میری عمر رسیدگی اور مسلسل صحت کی خرابی کی بنا پر، اس کی اُمید بھی افسردہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ سالِ گذشتہ کے ناقابلِ برداشت حوادث نے اس چراغِ تہ داماں کو قریب قریب گل کر دیا تھا اور جی رہا تھا تو صرف اس قرآنی مشن کے سہارے، جسے میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔ میرے قریبی احباب اس صورتِ حالات سے بڑے مشوش تھے ___ لیکن، ہو غم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کرے!

گذشتہ مارچ، اسی تشویش سے متاثر ہو کر، میرے قریب ترین قرآنی عزیز، عمر دراز خان کویت سے لاہور آئے۔ میں

> دنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبوبیت ﷺ کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے۔ ایک زندگی کیا، ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شاہنشاہِ کونین ﷺ کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو بھی دل کی تمنا بر نہ آئے۔ جس سینے میں عشقِ رسول ﷺ کا سوز نہیں، سینہ نہیں۔ بدبختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمد ﷺ پر مر مٹنے کی تمنا نہیں، دل نہیں، بوم و کرگس کا وحشت انگیز نشیمن ہے۔
>
> (ماہنامہ طلوعِ اسلام، دسمبر 1941ء، صفحہ 51-52)

نے اپنے متعلق انہیں ہزار مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ان جھوٹی تسلیوں سے ان کا جی نہ بہلا۔ انہوں نے احباب سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ان کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح موجودہ ماحول سے نکال لیا جائے جس کی فضا بڑی غم آلود ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے کافی کوشش کی ہے کہ انہیں کسی صحت افزا مقام پر لے جایا جائے۔ لیکن یہ اس پر آمادہ نہیں ہوتے۔ عمر دراز خان نے کہا کہ انہیں اس فضا سے نکالنے کے لئے بڑی زبردست کشش کی ضرورت ہے اور میں اس کشش کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ مجھے یقینِ واثق ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اور انہوں نے ایک دن، بلا کسی تمہید کے مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو مدینہ منورہ لے چلوں۔ اس کے لئے سب انتظام مکمل ہے۔ آپ تاریخ کا تعین کر دیجئے۔

میں نے یہ سنا تو میری آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپک گیا۔ میرے عروق مردہ میں برقِ تپاں کی لہر دوڑ گئی۔ میرے قلبِ حزیں میں یوں سمجھئے گویا اُمیدوں کے دروازے کھل گئے۔ مجھے حیاتِ تازہ کا پیام مل گیا۔ حیرت اور مسرت کے جذبات اس قدر تلاطم خیز تھے کہ میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ سمجھ لیا اور کہا کہ پروگرام یہ ہے کہ یہاں سے پہلے کویت چلیں۔ وہاں سے قرآنی احباب کا ایک قافلہ ہمرکاب ہوگا۔ خشکی کے راستے، مختلف مقاماتِ مقدسہ سے نورِ بصیرت حاصل کرتے آگے بڑھتے جائیں گے۔ راستے میں دہران، ریاض، طائف وغیرہ کے قرآنی احباب بھی چشم براہ ہیں۔ اس کے بعد ___ اس کے بعد ان کی آواز رِندھ گئی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

برادرِ گرامی میاں ظفر محمود (مشیر قانون فوجی فاؤنڈیشن) اتفاق سے پاس ہی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے کہ انہیں سفر کا کوئی مرحلہ بھی تنہا طے نہیں کرنے دینا چاہئے۔ میں قدمِ اوّل سے آخر تک ساتھ رہوں گا۔

اور یوں میری زندگی کی شاخِ خزاں دیدہ کو نویدِ بہار مل گئی۔

اس کے بعد ''سرخ فیتے'' کی پابندیاں راستے میں حائل ہونا شروع ہو گئیں جن کی وجہ سے پروگرام میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کویت کا ویزا تو بآسانی مل گیا لیکن سعودی عرب میں صرف عمرہ (یعنی جدہ، مکہ، مدینہ) کا ویزا مل سکا۔ اندرون ملک جانے کا نہ مل سکا۔ میں نے بہرحال اسی کو غنیمت سمجھا ___ 13 اپریل کی صبح، قدمِ اوّل کے طور پر جانبِ کراچی روانہ ہوا، اس احساس کے ساتھ شاداں و فرحاں کہ ؎

بایں پیری رہ یثرب گرفتم نواخواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سر شام کشاید پر بفکرِ آشیانہ

رُو بہ کراچی:

کراچی جہاز کی رسیدگی اور جدہ کے لئے دوسرے جہاز کی روانگی کے درمیان تھوڑا سا وقفہ تھا۔ میں نے کراچی کے احباب سے کہہ رکھا تھا کہ میری اس آمد کا چرچا نہ کریں۔ میں واپسی پر وہاں ٹھہروں گا تو سب سے ملوں گا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ قرآنی احباب، خلوص و محبت کے گراں قدر تحائف لئے، ہوٹل مڈوے میں جمع ہو گئے اور قرآنی مذاکرات کی ابتداء وہیں سے ہو گئی۔ عمر دراز خان پہلے کویت جا چکے تھے۔ میں اور محترم ظفر محمود صاحب شام کے جہاز سے جانبِ جدہ روانہ ہوئے۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس روائداد میں، نہ تو اپنے تاثرات شامل کروں گا اور نہ ہی کسی قسم کی تنقید و تبصرہ سے اس حکایت شیریں میں، تلخی پیدا ہونے دوں گا۔ اس کے لئے وہ کئی مواقع آئیں گے۔ میں سرِ دست اپنے آپ کو کوائف نویسی تک محدود رکھوں گا ___ کہوں گا تو صرف اتنا کہ میرے رفقاء جس طرح صعوباتِ سفر کے ہچکولوں کو اپنے آپ پر روکتے رہے اور ان کی جنبش تک بھی مجھ تک نہ پہنچنے دی۔ یہ سفر اسی سے ممکن ہو سکا ___ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

جدّہ:

وہاں کے وقت کے قریب آٹھ بجے شب، جدہ ائیر پورٹ پر پہنچے تو کویت کے قرآنی احباب۔ عزیزم عمر دراز خان، ان کی بیگم صاحبہ اور دونوں بچیوں کو (جو میرے لئے بمنزلہ اپنی بیٹیوں کے ہیں)۔ نیز محترم ماسٹر محمد طفیل اور شفیق صاحب اور دہران بزم کے میر محمد اسحٰق اور عزیزم خالد حمید کو سامنے منتظر پایا۔ سفر کی تمام کوفت مبدل بہ راحت ہو گئی۔

قرآنی رشتہ بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے! رات جدہ میں بسر کی 14 اپریل کی صبح قریب دس بجے، جس کعبہ کی طرف رخ کر کے تمام عمر نمازیں پڑھتے رہے، اس کی سمت عملاً گامزن ہوئے اس وقت سینہ میں جذباتِ شوق کا جو تلاطم برپا تھا، اخفا کی ہزار کوششوں کے باوجود، آنکھوں میں اُمنڈ آنے والے آنسو، اس کی غمازی کر رہے تھے۔

عمر بھر، مکہ اور اس کے مضافات کو، قرآن کے الفاظ میں، وادیٔ غیر ذی زرع (بے برگ و گیاہ وادی) لکھتا رہا لیکن اس کا مفہوم آج سمجھ میں آیا جب اس وادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ___ ''خشک پہاڑ، تپتے ہوئے صحرا، ویران دشت، بنجر زمین، بے آباد میدان وغیرہ الفاظ اکثر بولے جاتے ہیں، لیکن جو بھیانک منظر یہاں دکھائی دیا یہ الفاظ اس کا تصور تک پیش نہیں کر سکتے۔ سیاہ بھبنگ پہاڑ جن کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں آتش فشاں تھے۔ ان کے پتھر، پتھر نہیں بلکہ وہ ہیں جنہیں ہمارے ہاں ''کھنگر'' کہا جاتا ہے اور قرآن نے جنہیں بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ ۝ (105:4) کہا ہے۔ سبزہ تو ایک طرف، کہیں روئیدگی تک کا نشان نہیں۔ ان سے نیچے اتریئے تو ایسا ریگستان جس سے (اس نسبتاً معتدل موسم میں بھی) لُو کے شعلے اُبھرتے تھے۔ کہیں پانی کا قطرہ تک نہیں۔ زندگی کا سراغ تک نہیں۔ یہ تھا جدّہ سے مکہ تک کا راستہ جسے ہم طے کر رہے تھے۔ یہ تو حرمِ پاک کی متضاطیسی کشش ہے جو این و آں سے بے گانہ کشاں کشاں جانبِ منزل لئے جاتی ہے، ورنہ وحشت و

دہشت کے اس مسلسل منظر سے انسان کا دل بیٹھ جاتا ہے۔

ایک بجے کے قریب ہم بیت اللہ کے بابِ عالی کے سامنے تھے۔ لیکن قبل اس کے ہم بحضور کعبہ حاضر ہوں، جی چاہتا ہے کہ میں ان خیالات کو قلم بند کر دوں جو عظمتوں اور رفعتوں کی اس آماجگاہ کے ماحول کے متعلق میرے دل میں اُبھرے تھے۔ حرمِ پاک، ساری دنیا میں منفرد مقام ہے۔ اس کی انفرادیت اہمیت اور شرف ومجد کا تقاضا ہے کہ جونہی ہم جوارِ مکہ میں داخل ہوں، ہماری عقیدتوں کا یہ مرکز اُبھر کر ہمارے سامنے آ کر باعثِ فروغِ دیدہ اور وجہِ تسکینِ قلب ہو اور جوں جوں ہم اس کی طرف بڑھتے جائیں، شادابیاں اور نکہت پاشیاں فرشِ راہ بنتی جائیں۔ یعنی اس کی (Approacah) ایسی ہو کہ اس پر ہزار بہاریں نثار ہوں۔ لیکن مضافِ کعبہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کعبہ کے فطری محلِ وقوع کے متعلق یوں سمجھئے گویا ایک بہت بڑا پیالہ ہے جس کے پیندے میں حباب آسا ایک عمارت ہے۔ مکہ کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں اور ان کے اندر نشیب میں خانہ کعبہ ہے۔ اس کے اس محلِ وقوع کا بدل دینا تو ممکن نہ تھا لیکن اس کے بعد انسانی ہاتھوں نے جو کچھ کیا ہے اسے تو روکا جا سکتا تھا۔

حریمِ کعبہ بے شک ایک عظیم عمارت ہے لیکن اس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ شاہراہیں ہیں جن پر ہر وقت ٹریفک کا سیلاب رواں دواں رہتا ہے۔ ان شاہراہوں سے ملحق، ہر طرف سر بفلک عمارتیں ہیں اور یہ سلسلہ پورے حدودِ مکہ تک پھیلا ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حرمِ کعبہ ان عمارات کی بلندیوں تلے دب کر رہ گیا ہے۔ بس یوں سمجھئے گویا (لاہور کے) اندرون شہر محلہ کی کوئی مسجد ہو کہ جب تک آپ اس کے دروازے میں داخل نہ ہوں، اس کے عدم ووجود کا پتہ نہ چلے۔ ایسا ہی ماحول مسجد نبوی ﷺ کا ہے! دل انہیں بلند وبالا دیکھنا چاہتا تھا۔

طوافِ کعبہ:

اب ہمت کر کے آگے بڑھئے۔ ہم نے احرام جدّہ سے باندھ لیا تھا۔ سب سے پہلے عمرہ کے مناسک ادا کرنے ضروری تھے اور ان میں سرفہرست طوافِ کعبہ تھا۔ وسیع وعریض صحنِ کعبہ مسقّف نہیں، اس لئے اس وقت وہاں تپش کافی تھی۔ لیکن طائفین کا جذب وکیف اس سے کب متاثر ہوتا ہے۔ وہ انتہائی محویت کے عالم میں، سرفروشانہ انداز سے، مصروفِ طواف تھے۔ ہمارے کارواں کی جوئے کم آب بھی اس بحرِ بے کنار میں جذب ہو گئی۔ اس بے خودی کے عالم میں میرے لب پر قرآنی دعائیں تھیں۔ میں سبقت کرتا تھا اور میرے ہم نوا احباب انہیں اسی ذوق وشوق سے دھرائے جاتے تھے ___ دل سوز سے لبریز۔ لب پر یہ پرکیف صدائیں۔ آنکھیں زمزمہ بار۔

دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ میرے مضمحل اعصاب شاید اس تپش کو برداشت نہ کر سکیں۔ لیکن حسنِ اتفاق کہ عین اس وقت صحنِ حرم پر بادل سایہ فگن ہو گئے اور ہلکا سا ترشح بھی ہوا جس سے موسم خاصا معتدل ہو گیا۔ میرا سر نیاز بے ساختہ بدرگاہِ رب ذوالمنن جھک گیا۔

اتنے میں کبوترانِ بامِ حرم کا ایک جھرمٹ صحنِ کعبہ میں اُتر آیا جسے دیکھ کر اقبالؒ کی وہ دعالب پر آ گئی جو انہوں نے اُمتِ مسلمہ کے ضعف و ناتوانی کو سامنے رکھ کر مانگی تھی کہ ؎

بہ جلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم بجز ایں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابی

کعبہ کے دروازہ کے سامنے آیا تو یوں سمجھئے کہ جھولی پھیلا کر، مبداء جود و سخا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ ؎

خواجۂ من، نگاہ دار آبروئے گدائے خویش آنکہ کہ زجوئے دیگراں، پُر نہ کند پیالہ را

خانۂ خدا کا دروازہ خالص سونے سے منڈھا ہوا ہے جس کے نیچے، سونے ہی کے جلی حروف میں جلالت الملک (شاہ) خالد ابن سعود لکھا ہے (بعد کے الفاظ اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں)۔

گراں بہا سنگِ مرمر کے اس نبار اور زرِ خالص کے اس سیلاب میں، گداگروں کے پھیلائے ہوئے ہاتھ، عجیب تضاد پیدا کر رہے تھے۔ لیکن میں نے تو خاموش رہنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس لئے ؎

اگر یک سرموئے برتر پرم فروغِ تجلی بسوزد پرم

سعیٔ:

سعی بین الصفا والمروہ کا مرحلہ خاصا مشقت طلب نظر آیا۔ اگرچہ وہاں اب نہ وہ پہاڑیاں ہیں اور نہ ہی وہ ریگ زار۔ اسے مسقّف بھی کر دیا گیا ہے اور خنک بھی۔ لیکن زیادہ چلنے سے میرے پاؤں میں جو لغزش پیدا ہو جاتی ہے اس سے اس سعی کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ لیکن مجھ جیسے مریضوں کے لئے وہاں پہیے دار کرسیوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ جواں سال و جواں بخت عزیزم خالد کی قوتِ بازو نے یہ مرحلہ آسان کر دیا۔

ظہر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کرنے کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے۔ یہ ہوٹل، حریم کعبہ کے سامنے تھا لیکن وہ بلند و بالا عمارات جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، مستقل حجاب بن کر حائل تھیں۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی وہیں جا کر پڑھیں۔ بجلی کی روشنی کے سیلاب میں اس کی جگمگاہٹ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ لیکن میری نگاہیں کچھ اور دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ کسی نے شاید میرے قلبِ مضطر کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ آ چکے ہیں، مگر انتظار باقی ہے۔

---

15 اپریل:

صبح دس بجے کے قریب میدانِ عرفات دیکھنے کے لئے گئے۔ حج اِسی مقام پر ہوتا ہے۔ ایک لق و دق، بے برگ و گیاہ میدان جس کے ایک جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر (جسے جبلِ رحمت کہتے ہیں)۔ ایک (سفید) سا نشان ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کا خطبہ وہاں سے نشر فرمایا تھا ___ وہ خطبہ جلیلہ جو نوعِ انسان کی آزادی کا عالم گیر منشور ہے۔

میدانِ عرفات:

حضور کے عہدِ ہمایوں میں، عرفات کے میدان میں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کا اجتماع ہوا تھا۔ لیکن نگہِ نبوی ﷺ کس قدر دُوررس تھی کہ اس کے لیے ایسے میدان کا انتخاب کیا گیا کہ آج بیس لاکھ کا جمِ غفیر بھی اس کے ایک گوشے میں سما جائے۔

نظامِ خداوندی کی یہی وہ نشرگاہ ہے جہاں سے ایک دن پھر اس انقلابِ عظیم کی آواز بلند ہونی ہے جس نے نوعِ انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلانی ہے۔ کس قدر بلند و بالا ہے مرتبہ اس چھوٹی سی پہاڑی کا!

پروگرام طائف جانے کا بھی تھا۔ لیکن ایک ناشُدنی حادثہ کی وجہ سے وہاں نہ جا سکے۔

16 اپریل:

شام کو منیٰ گئے اور وہاں جو کچھ دیکھا اسے بیان کرنے کے لئے بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ___ ہوش میں آلوں تو کہوں!

یہ وہ مقام ہے جہاں قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ پہلے ان لاکھوں جانوروں کو ذبح کرنے کے بعد گڑھوں میں دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ زمین ان کی متحمل نہ ہو سکی۔

منیٰ کی بھٹیاں:

اب وہاں مہیب بھٹیاں نصب ہیں۔ ان ذبح شدہ جانوروں کو اُن بھٹیوں میں ڈال کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جاتا ہے۔ میں ان بھٹیوں کو دیکھ رہا تھا اور نوائے سروش یہ سرگوشی کر رہی تھی کہ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ، منہ سے کچھ نہ کہ!

آگے بڑھے تو ان تین ''شیطانوں'' سے ملاقات ہوئی جو لاکھوں حاجیوں کے کروڑوں سنگ ریزوں کا ہر سال ہدف بنتے ہیں لیکن ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ پہلے یہ کھلے آسمان کے نیچے ایستادہ تھے لیکن اب پتھراؤ کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے اس ابلیسؔ گاہ کو دو منزلہ بنا دیا گیا ہے اور اسی ضرورت کے تحت' ان (شیاطین) کو زیادہ قدآور کر دیا گیا ہے، حالانکہ (اقبالؒ کے قول کے مطابق) شیطان نے مدت ہوئی یہ کہہ کر بدرگاہِ ربُ العزت اپنی رٹیائرمنٹ کے لئے درخواست گذران دی تھی کہ

جمہور کے ابلیسؔ ہیں اربابِ سیاست باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

(بالِ جبریلؔ)

17 اپریل:

صبح کی نماز مسجد الحرام میں بالخصوص اس مقصد کے لئے ادا کی کہ نور کے تڑکے، اس کی ایمان افروز اور سکون افزا فضا سے قلب و نگاہ کو سیراب کر سکوں لیکن بجلیوں کی خیرگی نے اس مسحور کن فضا کو بار یاب نہ ہونے دیا۔ اے کاش! کوئی اس فضا کی نورانیت کو سمجھ سکتا اور فجر سے پہلے اس مصنوعی روشنی کی جگہ فطرت کی جوئے نور کو اذنِ آئینہ پاشی دیتا!

رہِ بطحا گرفتم

مکہ میں مناسکِ عمرہ ادا کرنے، اور ان مقامات کی زیارت کرنے کے بعد، جن تک ویزا کی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے، رسائی ممکن تھی، دیارِ حبیب ﷺ سے تطہیرِ قلب ونگاہ کی آرزو شدّت اختیار کر رہی تھی۔ چنانچہ 17 اپریل ہی کی سر پہر، ہمارا کاروانِ شوق جانبِ بطحا جادہ پیما ہوگیا۔ حوالیٔ مکہ سے باہر نکلتے ہی وہ پہاڑی نظر آئی جس پر غارِ حرا واقعہ ہے۔ پہاڑی خاصی اونچی ہے اور غار تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہیں بنایا گیا۔ اس لئے اس تک پہنچا نہ گیا۔ اور ہم آگے روانہ ہوگئے۔

جو کچھ انسانی ہاتھوں نے بنایا ہے، اسے چھوڑ کر، مکہ سے مدینہ تک (قریب تین سو میل) کا راستہ اسی قسم کے پہاڑوں۔ صحراؤں بے برگ وگیاہ میدانوں۔ بیابانوں اور ویرانوں پر مشتمل ہے جس کا میں نے جدّہ سے مکہ تک کے راستے کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ البتہ اس راستے میں کہیں کہیں بہتا پانی نظر آیا جس کے متعلق بتایا گیا کہ حال ہی میں بارش ہوئی ہے۔ کہیں کہیں سبزہ بھی دکھائی دیا۔ لیکن یہ سب ویرانیاں خارجی ماحول سے متعلق تھیں۔ ہماری داخلی دنیا میں وفورِ شوق سے جو جنتیں اُبھر رہی تھیں ان کی نکہت پاشیوں نے اس ماحول کو نگاہوں سے یکسر اُوجھل کر رکھا تھا۔ اور اس کی جگہ کچھ اور ہی نگاہ کے سامنے تھا۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خنداست — شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو! آہستہ تر نہ — چوما، ہر ذرہِ او درد مند است!

(ارمغانِ حجاز)

مسافت سمٹتی جارہی تھی اور میں اس قسم کے خیالات میں مستغرق تھا کہ آج اس راستے میں ہموار پختہ سڑک ہے۔ کہیں کہیں آبادیاں بھی ہیں۔ منزلیں بھی ہیں جہاں سامانِ خورہ ونوش بھی میسر ہے۔ نہ رہزنوں قزاقوں کا ڈر ہے، نہ درندوں کا خوف۔ لیکن وہ کیا کشش تھی جو آج سے چودہ سو سال پہلے، مہاجرین السابقوں کے بے ساز وسامان قافلوں کو ان وحشت زا اور دہشت خیز ریگستانوں اور ویرانوں میں رواں دواں لئے چلی آتی تھی! کشش ایک بلند وبالا مقصد کے حصول کی۔ قوت ایک مستحکم ایمان کی!

شہدائے بدر کے مزار:

ذرا آگے بڑھے تو کسی نے یہ نشیدِ جانفزا سنائی کہ یہاں شہدائے بدر کے مزار ہیں۔ سوچئے کہ اس کے بعد کس کا قدم آگے اُٹھ سکتا تھا؟ لیکن وہاں جاکر جو کچھ دیکھا اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ

مرا درد یست اندر دل، اگر گویم زباں سوزد — وگردم در کشم، ترسم کہ مغز استخواں سوزد

ایک چار دیواری کے اندر بے ہنگم بکھرے ہوئے پتھر۔ نہ کوئی مزار۔ نہ کسی مزار کی تختی!

آگے بڑھے تو دیارِ حبیب ﷺ کی روشن شمعیں وجہِ فروغِ دیدہ ہوئیں۔ دل تڑپ تڑپ اٹھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وفورِ جذبات سے مجھ پر کیا گذرتی اگر میرا شعور میری یاوری نہ کرتا اور مجھے چودہ سو سال پیچھے لے جا کر، اس فردوس آفریں منظر کو سامنے نہ لے آتا جب حضور نبی اکرم ﷺ ہجرت کے وقت قربِ مدینہ میں جمال افروز ہوئے تھے اور مدینہ کے سعادت مند انصار رضی اللہ عنہم نے والہانہ انداز سے حضور ﷺ کا استقبال کیا تھا۔ چالیس سال پہلے میں نے اس منظرِ جانفزا کو ان الفاظ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی:

ہجرتِ نبوی ﷺ:

اس طرح رواں دواں، نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے یہ قافلۂ جذب و سرور مدینہ کی طرف بڑھتا گیا۔ اور 8 ربیع الاوّل (23 ستمبر) کی صبح مدینہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی جماعت حسبِ معمول انتظار کے بعد واپس لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرآئن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرشِ راہ بن رہی ہیں۔ اس نے آواز دی کہ ''اہلِ عرب! لو جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آ گیا۔'' تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور انصار ہتھیار سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے اور پروانہ وار اس آواز کی سمت بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قبآء کہتے ہیں۔ حضور ﷺ یہاں پہنچے تو افرادِ خاندان نے جوشِ مسرت میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی اور حضور ﷺ نے ان کی میزبانی قبول فرمالی۔ یہاں سب سے پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا مرکز ہوتی ہی مسجد ہے۔ یہ مسجدِ قباء تھی۔

چودہ (14) دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ اس سرزمین میں جسے حکومتِ خداوندی کا گہوارہ بننا تھا، جماعتِ مومنین کا پہلا اجتماع تھا۔ کس قدر حسین تھی یہ ابتداء! قباء سے مدینہ تک راستہ میں دو رویہ فدائیین صفیں تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور فرطِ عقیدت سے معمورۂ جذب و نشاط اور گہوارۂ حسن و بہار بن رہا تھا۔ گلی کوچوں سے خدا کی حمد و ستائش کے نغمے اور تشکر و امتنان کے زمزمے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت بیز بنا رہے تھے ___ جوشِ استقبال سے قلوب کے ساغر اس طرح بے محابا چھلک رہے تھے کہ صہبائے محبت، مسرت و ابتہاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامان و آستین کو صحنِ گلستاں و کفِ باغبان بنا رہی تھی۔ کہیں جبیں ہائے نیاز بحضور رب ذوالمنن سجدہ ریز و زمین بوس تھیں اور کہیں ہجومِ جذبات سے مرتعش ہاتھ تھے کہ بارگاہِ صمدیت میں اس مہمانِ ﷺ عزیز کی خیر سگالی اور خوش بختی کی حسین دعائیں اور معصوم التجائیں لئے ہوئے یوں جانبِ عرشِ عظیم اٹھ رہے تھے جیسے خاموش صحرا میں نخیلِ بلند ایستادہ۔ خاکِ یثرب کے ذرات ابھر ابھر کر ہمہ تن دید بن رہے تھے کہ آج انہیں اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمام عالم کے لئے سرمایۂ فخر و ناز تھی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں جوشِ مسرت میں دَف بجاتیں اور یہ استقبالیہ نغمہ گاتی تھیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَادَعَى لِلّٰهِ دَاعِ

خلوص ومحبت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حسن وخوبی یثرب کی وادی میں داخل ہوا جس کا نام اس کے بعد ''مدینۃ النبیؐ'' ہوگیا۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں حضور ﷺ کی میزبانی کی سعادت کس کے نصیب ہوتی ہے۔ یہ شرف حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مقدر میں تھا۔ جہاں اب مسجدِ نبوی ﷺ ہے۔ حضرت ایوب رضی اللہ عنہ کا مکان اس سے متصل تھا۔ حضور ﷺ وہیں فروکش ہوگئے۔''

(معراجِ انسانیت، ص:223)

رات کے قریب دو بجے، جوارِ مدینہ میں داخل ہوئے تو بے ساختہ میری زبان پر تھا۔

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود! یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست؟

اور رفقائے سفر سے اتنا کہہ سکا کہ

بیا اے ہم نفس! باہم بنالیم من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم! بپائے خواجہؐ چشماں را بمالیم

(ارمغانِ حجاز)

قلبی کشش بے پناہ تھی لیکن میری حالت کو دیکھتے ہوئے احباب نے یہی مناسب سمجھا کہ میں اس وقت روضۂ اطہر کی جاروب کشی کے لئے نہ جاؤں۔ اس میں شبہ نہیں اس سفر کو میرے لئے پُرآسائش بنانے کے لئے تمام احباب نے اپنی اپنی جگہ بڑی دلدوزی سے کام لیا لیکن اخی مکرم میاں ظفر محمود کی نگاہ ہمیشہ میرے دل پر رہتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ مجھے نازک اور مشکل مقامات پر نہ تھامتے تو نمعلوم میں کس وقت ڈھیر ہوکر رہ جاتا۔ میں ان کی اس عناں گیری کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟

اور 18 اپریل کی صبح دس بجے میں (رفقاء کی معیت میں) مسجدِ نبوی ﷺ میں گنبدِ خضریٰ کے سامنے سرنگوں کھڑا تھا!

کہاں میں! کہاں یہ مقام!!___ اللہ! اللہ

میں آنکھیں بند کئے کھڑا تھا کہ یکا یک علامہ اقبالؒ عالمِ تصور میں سامنے آگئے۔ وہ ساری عمر دیارِ نبوی ﷺ کی خاک بوسی کی آرزو کو حرزِ جاں بنائے رہے۔ جنوری 1938ء کی آخری ملاقات کا وہ جگر پاش منظر مجھے کبھی نہیں بھولتا جب علامہ اسلم جیراجپوری نے ان سے کہا کہ آپ کا حجازِ مقدس جانے کا ارادہ تھا؟ فرمایا کہ عالمِ تصور میں تو میں دن رات انہی راستوں میں رہتا ہوں لیکن اس بیماری میں یہ آرزو برآتی نظر نہیں آتی۔ یہ کہا اور ان پر غشی کا سا عالم طاری ہوگیا۔ دورہ اس قدر جانکاہ تھا کہ (سید نذیر نیازی مرحوم کے ایما پر) یہی مناسب سمجھا کہ محفل برخواست کردی جائے۔ میں سوچتا تھا کہ حضرت علامہؒ اس آرزو کو دل میں لئے عالمِ جاوداں کی طرف تشریف لے گئے اور میں کس قدر خوش بخت ہوں کہ میری آرزو یوں پوری ہورہی ہے۔ میں دل ہی دل

میں یہ باتیں کر رہا تھا اور بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے علامہؒ ہی کے یہ اشعار میری زبان پر تھے کہ

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند — آسماں از بوسۂ بامت بلند
از تو بالا پایۂ ایں کائنات — فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمع حیات افروختی — بندگان را خواجگی آموختی!

(مثنوی رموز واسرار)

پھر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ تو ملتِ اسلامیہ کا درد سینے میں اُمنڈ آیا اور عرض کرنے کی جرأت کی کہ

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکارِ بے نظامِ او چہ گویم! — تو می دانی کہ مِلّت بے امام است!

اور کبھی یہ کہ

نگہبانِ حرم معمار ویز است — یقینش مُہ دہ وچشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہِ اوچہ گویم! — کہ نو مید از ہمہ اسباب خیراست

(ارمغانِ حجاز)

التزام یہ رکھا کہ نماز میں امام کے قریب تر جگہ مل جائے کہ حضور ﷺ جس محراب میں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے، وہ اس کے قریب ہی تھا۔ اس سے عالمِ تصور قلبی تسکین کا سامان فراہم کر دیتا تھا۔

کسی نے مکہ اور مدینہ کے لئے جن تعظیمی الفاظ کا لاحقہ تجویز کیا تھا وہ معنویت کے اعتبار سے بڑا بلیغ تھا۔ یعنی مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ۔ مکہ کی عظمت سے ذہن متاثر ہوتا ہے اور مدینہ کی نورانیت سے قلب رشکِ طور۔

---

19 اپریل:

مختلف تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے نکلے۔ سب سے پہلے مسجدِ قباء کو دیکھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ سب سے پہلی مسجد تھی جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ سے باہر تعمیر فرمایا تھا۔ چنانچہ اس کے دروازے پر خدا کی یہ شہادت کندہ ہے: لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ ۔۔۔ (9:108) لیکن موجودہ مسجد کا صرف محل وقوع وہی ہے۔ مسجد حال ہی کی تعمیر کردہ۔ یہی کیفیت ہر تاریخی مقدس مقام کی ہے۔

مسجدِ قباء:

اس کے بعد جنگِ اُحد کے میدان کو دیکھا۔ وہاں بھی پہاڑ تو وہی ہے لیکن اس کے دامن میں ماڈرن بنگلے اور کوٹھیاں آباد

ہیں۔شہداء کے مزارات کا بھی کوئی نشان نہیں۔لوہے کے ایک جنگلے کے اندر چند پتھر رکھے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت (یا مزار) کا نشان ہے۔وہاں ان معلومات کے حاصل کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں۔

اس سے ذرا آگے ''بئر عثمان رضی اللہ عنہ'' (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کنواں) ہے۔یعنی وہ کنواں جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی سے خرید کر اہلِ مدینہ کی ضروریات کے لئے وقف کر دیا تھا۔یہ کنواں' اس کی کہنگی اور خستگی کے پیشِ نظر' شاید اپنی اصلی حالت میں ہو۔لیکن اس کی غلاظت، چمگادڑیں اور بلیوں کے بچے، ہماری بے حسی کے نوحہ خواں ہیں۔

مسجدِ ذو قبلتین:

ازاں بعد ''مسجدِ ذو قبلتین'' دیکھنے گئے۔اس مسجد کی داستان دلچسپ بھی ہے اور تاسف انگیز بھی۔روایات کی رُو سے (جو بالبداہت وضعی اور یہودی سازش کا نتیجہ نظر آتی ہیں) کہا یہ جاتا ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ (نبوّت کی) زندگی میں حضور ﷺ، بیت المقدس کی طرف رُک کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اگرچہ چاہتے تھے کہ رخ کعبہ کی طرف کیا جائے۔اس کے لئے آپ ﷺ نے شکل یہ اختیار کی کہ حرمِ کعبہ میں نماز کے لئے اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی، کیونکہ یہ دونوں ایک سیدھ میں پڑتے تھے۔جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں یہ انداز نباہنا مشکل ہو گیا اس لئے کہ اب بیت المقدس (یروشلم) اور کعبہ (مکہ) دو مخالف سمتوں میں پڑتے تھے۔اگر منہ بیت المقدس کی طرف کرتے تو کعبہ کی طرف پشت ہو جاتی اور کعبہ کی طرف رخ کرتے تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہو جاتی۔اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے۔پڑھنے کو تو آپ ﷺ اس طرح نماز پڑھتے، لیکن آپ ﷺ دل سے اُسے پسند نہ فرماتے۔قریب سترہ ماہ (اور بعض روایات کی رُو سے، قریب دو سال تک) آپ ﷺ اسی نہج سے نماز ادا فرماتے رہے۔تآنکہ ایک دن جب آپ ﷺ، ایک غیر معروف سی مسجد میں، ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے، عین حالتِ نماز میں خدا کی طرف سے حکم آیا کہ آپ ﷺ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔حکم آنے پر آپ ﷺ نے۔۔۔(باقی نماز کے لئے) اپنا رُخ بدلا اور آپ ﷺ کے ساتھ مقتدیوں نے بھی۔رُخ بدلنے کا نقشہ اس طرح ذہن میں لائیے کہ اگر پہلے منہ مغرب کی طرف تھا تو اب مشرق کی طرف کرنا پڑا۔مقتدیوں نے تو رخ کھڑے کھڑے بدل لیا ہوگا۔لیکن ظاہر ہے کہ امام (حضور ﷺ) کو مسجد کا نصف چکر کاٹ کر، دوسری جانب امامت کے لئے جانا پڑا ہوگا۔جس مسجد میں (روایات کی رُو سے) یہ واقعہ پیش آیا اُسے مسجدِ ذو قبلتین کہتے ہیں۔(یعنی دو قبلوں والی مسجد) اس سے پہلے، اس مسجد کی بالمقابل دیواروں میں دو محراب تھے ___ ایک کا رُخ جانب بیت المقدس تھا اور دوسرے کا جانبِ کعبہ ___ نماز تو اُسی محراب میں کھڑے ہو کر پڑھائی جاتی تھی جس کا رخ جانبِ کعبہ تھا لیکن مقابل کا محراب بطور یادگار قائم رکھا تھا۔اب اس دوسرے محراب کی جگہ دیوار پر نشان سا دے دیا گیا ہے لیکن مسجد کو ذو قبلتین ہی کہا جاتا ہے۔(میں نے اس کی تفصیل اپنی

کتاب ''مطالب الفرقان'' جلد سوم، ص: 82 میں لکھی ہے جس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ روایات کس طرح یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ حیرت ہے کہ (علاوہ دیگر دلائل وشواہد) اتنی سی بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں سب سے پہلے مسجدِ قباء تعمیر فرمائی اور اس کے تھوڑے دنوں بعد مسجدِ نبوی ﷺ۔ ان دونوں مسجدوں کا رُخ کعبہ کی جانب ہے۔ اگر حضور ﷺ مدینہ میں ہجرت کے بعد سترہ ماہ یا دو سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرماتے رہے تھے تو ان مسجدوں کا محرابِ اوّل، جانب بیت المقدس ہونا چاہئے تھا اور دوسرا محراب کعبہ کی سمت۔ لیکن ان مسجدوں میں ایک ہی محراب ہے اور وہ جانبِ کعبہ ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ حضور ﷺ ہجرت کے بعد، یومِ اوّل ہی سے، کعبہ کی سمت رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ ایسی محسوس اور واضح شہادت ہے کہ اس کے بعد اس غیر معروف سی مسجد میں، حالتِ نماز میں تحویلِ قبلہ کا واقعہ بالکل بے سند رہ جاتا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ چودہ سو سال سے (یا جب سے یہ روایات وضع ہو کر کتبِ احادیث میں راہ پا گئیں) اس مسجد کو ''ذو قبلتین'' پکارے جا رہے ہیں اور تحویلِ قبلہ کے اس (وضعی) واقعہ کو مستند تسلیم کئے جا رہے۔۔۔! ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کی سند وہ روایات ہیں جنہیں وضعی کہنے کی کسی کو جرأت نہیں۔

جنت البقیع:

ان مقامات کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن سب سے زیادہ کشش جنت البقیع کی تھی۔ وہ عہدِ رسالتمآب ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مدینہ کا سب سے بڑا قبرستان تھا جس میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہا ___ جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ عظیم المرتبت ائمہؒ وغیرہ محوِ خواب ہیں۔ ان کے مزارات کے ساتھ صدرِ اوّل کی ساری تاریخ وابستہ ہے اس لئے اس کی اہمیت واضح ہے۔ شام کے قریب کشاں کشاں وہاں گئے اور جس وفورِ عقیدت واحترام سے گئے تھے اس سے ہزار گنا زیادہ تأسف ہی نہیں، صدمہ کے ساتھ واپس لوٹے۔ لوہے کی سلاخوں والے دروازے کے اندر ویران پتھروں کا میدان ہے جس میں کوئی مزار تو ایک طرف، کسی مزار کی تختی تک نہیں۔ نہ ہی دروازے کے باہر ان حضرات کے اسماء گرامی کی کوئی فہرست ہے جن کے مزارات کے نشان تک باقی نہیں۔ میرا مرض، پریشانی، غم اور صدمات سے بڑھ جاتا ہے۔ اتنے دنوں چلتا پھرتا رہا لیکن یہاں پہنچ کر کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ چلنا تو ایک طرف، کھڑے رہنا بھی دشوار ہو گیا۔ احباب بمشکل مسجدِ نبوی ﷺ تک لے کر آئے۔

دہران کے احباب نے بڑی کوشش کی وہاں جانے کی اجازت مل جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہاں کے قرآنی احباب کا ٹیلی فون آتا تھا کہ دہران آنے کا کوئی انتظام کیا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور انہیں (اور ان کے ساتھ مجھے بھی) بڑی مایوسی ہوئی۔ اسی طرح ریاض کے احباب کو بھی۔ 20 اپریل کی صبح، عزیزم خالد حمید واپس روانہ ہو گئے۔ آخری دنوں حسنِ اتفاق سے، چوہدری محمد رمضان صاحب کی احبابِ کویت سے ملاقات ہو گئی۔ یہ کبھی وہاں ہوتے تھے۔ آج کل جدّہ میں ہیں۔ بیوی

بچوں سمیت، مختصر سے قیام کے لئے مدینہ آئے تھے۔ بڑے خلوص اور محبت کے پیکر۔ اگرچہ وہ بھی ہماری طرح مدینہ میں اجنبی تھے، لیکن انہوں نے مجھ مریض کے آرام اور آسائش کے لئے اتنا کچھ کیا جو یکسر غیر متوقع تھا۔ یہاں سے روانہ ہو گئے تو جدّہ کی شب بھی اسی میزبانی کا حق ادا کیا۔ قرآن کا رشتہ بھی کس قدر پُرخلوص اور گہرا ہوتا ہے۔

21 اپریل:

آج اس رحمتوں کے سرچشمہ میں، (جسے اقبالؒ نے ___ اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است ___ کہہ کر پکارا تھا) قیام کا آخری دن تھا اور اس احساس سے دل بوجھل ہو رہا تھا۔ میں نے اس شہر کی گلیوں کی حرمت اور تقدس کے متعلق قریب چالیس سال پہلے جو کچھ کہا تھا، اس کی یاد ذہن میں تازہ ہو رہی تھی۔

ہوا یوں کہ امریکہ کے ایک دریدہ دہن اخبار نے حضور ختمی مرتبت (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی شانِ اقدس و اعظم میں کچھ نازیبا الفاظ کہے۔ جس کے خلاف، سر عبدالحلیم غزنوی (مرحوم) نے اسمبلی میں التوا کی تحریک پیش کی۔ لیکن حکومت نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اس پر میں نے، قلم خونچکاں سے لکھا کہ

مدینہ کی گلیاں:

دنیا کو شاید ابھی معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک، جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن بھی موجود ہے، حضور سرورِ دو عالم ﷺ کی قدر و منزلت کیا ہے۔ وہ ذاتِ گرامی ﷺ (فداہ ابی وامی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعثِ نجات وسعادت اور جن کی محبت سرمایۂ زندگی اور متاعِ حیات ہے، ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم، اور دنیا کی بلند ترین سرفرازیوں کا پیکرِ مقدس ہے۔ اس ذاتِ فخرِ موجودات کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا، ہم تو ان کوچوں اور گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے جن کے ذرات کو اس پیکرِ رفعت و عظمت کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہو گئی۔ خوشا بخت ہیں وہ راہیں جن میں وہ شمع فروزاں، ضیا بار و جلوہ ریز ہوئی، اور زہے نصیب خاک کے ان ذروں کے جو ان درخشندہ و تابناک نقوشِ قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ دنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبوبیت ﷺ کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے۔ ایک زندگی کیا، ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شاہنشاہِ کونین ﷺ کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو بھی دل کی تمنا بر نہ آئے۔ جس سینے میں عشقِ رسول ﷺ کا سوز نہیں، سینہ نہیں۔ بدبختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمد ﷺ پر مر مٹنے کی تمنا نہیں، دل نہیں، بوم و کرگس کا وحشت انگیز نشیمن ہے۔ (ماہنامہ طلوعِ اسلام، دسمبر 1941ء، صفحہ 51-52)

الوداع:

آج ان گلیوں کو الوداعی سلام کہنے کا وقت آ گیا۔ عصر کی نماز، امام کے عین پیچھے ادا کی۔ پھر بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں آخری حاضری کے لئے جو کھڑا ہوا ہوں تو کچھ یاد نہیں پڑتا کہ دل کی کیا حالت تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ___

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار ___ اس محویت میں بھی اقبالؒ کی وہ دعا بے ساختہ زبان پر آ گئی جسے میں برسوں سے دہراتا اور لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں راز خارم پاک کن!
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

اور ؎

گر درِ اسرارِ قرآن سفتہ ام با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزوجل عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

ان آرزوؤں اور تمناؤں کے اظہار کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔

رات 8 بجے کے جہاز سے روانہ ہوکر، 9 بجے کے قریب جدّہ آ گئے۔ میر محمد اسحٰق اور چوہدری محمد رمضان صاحب کے حسنِ انتظام کے تصدق، رات، الواحا ہوٹل میں بڑے آرام سے بسر کی۔ 22 اپریل، بارہ بجے کے جہاز سے روانہ ہوکر، چار بجے کے قریب کویت پہنچ گئے۔ جہاں قرآنی احباب ائیر پورٹ پر موجود تھے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں کویت کی روئداد پیش کروں، سفرِ حجاز کا ایک قرض میرے ذمے ہے جس کا اتارنا ضروری ہے۔ میں قدم قدم پر یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ وہاں، میری آنکھیں جو کچھ دیکھنے کو ترستی تھیں، ترستی رہ گئیں۔ وہ کیا تھا جسے دیکھنے کے لئے وہ ترستی رہ گئیں؟

ترستی ہوئی آنکھیں:

اس میں شبہ نہیں کہ جب مسلمان عازمِ حجاز ہوتا ہے تو اس کا اولین مقصد، حج یا عمرہ کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ آرزو بھی موجزن ہوتی ہے کہ ان شہروں کو دیکھیں جن میں حضور ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم بستے تھے۔ ان مکانوں کو دیکھیں جن میں وہ فروکش تھے۔ مکہ اور مدینہ کی ان گلیوں اور راستوں کو دیکھیں جن پر ان کے نقوشِ پا ثبت ہوئے تھے۔ ان میدانوں کو دیکھیں جن میں عالمگیر انقلاب کی جنگیں لڑی گئی تھیں۔ اس زمانے کی تہذیب وتمدن کے آثار کو دیکھیں۔ ان کے اندازِ بود و ماند کا مشاہدہ کریں۔ ان مساجد کو دیکھیں جن سے لا الٰہ الا اللہ کا باطل شکن نعرہ سب سے پہلے بلند ہوا تھا اور جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی اوّلیں شہادت گاہ بنی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کی آرزو دل میں لے کر مسلمان وہاں جاتا ہے۔ لیکن اسے وہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ، تعمیر و تحسین اور جلال و جمال کے اعتبار سے مکہ اور مدینہ کا شمار دنیا کے عظیم ترین شہروں میں ہوتا ہے وہاں کی سر بفلک عمارات، نیویارک اور واشنگٹن کو مات کرتی

ہیں۔ وہاں کی مساجد، ماڈرن طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ حریم کعبہ اور مسجدِ نبوی ﷺ کی آرائش وزیبائش پر کروڑوں دینار صرف ہوئے ہیں (اور ہو رہے ہیں) لیکن مسلمان تو ان مٹی کے مکانوں اور کھجور کے پتوں سے مسقّف مسجدوں کو دیکھنے کی آرزو لے کر جاتا ہے جن کے ذرّے ذرّے سے اسے عشق ہے۔ ان یادگاروں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے سے انسان کے دل پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جو قومیں اس کی اہمیت کو جانتی ہیں، وہ اپنے آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ دُور کیوں جایئے۔ ہم موہن جوڈارو کے کھنڈرات کی حفاظت کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ (اور دنیا کی دیگر اقوام بھی اس میں مدد ومعاون ہوتی ہیں) حالانکہ موہن جوڈارو کا ہم سے اتنا ہی تعلق ہے کہ تقسیمِ ہند کی لکیر کھینچتے وقت، وہ ہماری طرف آ گیا۔ ارضِ حجاز کے ان مقدس آثار میں سے کچھ بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھے جاتے تو اس سرزمین کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ میں اس تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا کہ وہاں کوئی دیوار تک بھی ایسی نظر آ جائے جو اسلام کے صدرِ اوّل کی یادگار ہو۔ ایک دن کسی نے کہا کہ فلاں مقام پر وہ مکان ہے جس میں حضور رحمتِ دوعالم ﷺ کی ولادت ہوئی تھی۔ رواں دواں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ایک لائبریری ہے۔ یعنی اس مکان کی جگہ ایک جدید عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں لائبریری قائم ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اب اس نوحہ خوانی سے کچھ حاصل نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ آثار تو ایک طرف، وہاں ان کی نشاندہی کے لئے تختیاں تک بھی نہیں۔ اس نقصان کا اب ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جو آثار معدوم ہو چکے ہوں، وہ واپس کیسے آ سکتے ہیں؟ اب تو بر سبیل تنزل اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ تاریخ اور علم الآثار کے محققین سر جوڑ کر بیٹھیں۔ ان یادگاروں کی جو تفاصیل میسر آئیں ان کے مطابق ان کے نقشے مرتب کئے جائیں۔ مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ کے قریب وجوار میں، ڈزنی لینڈ کے انداز کا وسیع وعریض عجائب گھر قائم کیا جائے، جن میں ان نقشوں کے مطابق ان مقدس یادگاروں کے مثنےٰ تعمیر کر کے رکھے جائیں۔ اس سے کم از کم ذوقِ نظر کی تسکین تو ہو جائے گی۔

میں نے اپنے احساسات کے اس حصے کو اس لئے قلم بند کرنا ضروری سمجھا ہے کہ (آج نہیں تو شاید کل) کسی کو اس تجویز کی اہمیت کا احساس ہو جائے اور کوئی جماعت یا مملکت، اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی سعادت حاصل کر لے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اتنا عرض کر دوں کہ میں نے اپنی مختلف تصنیفات (بالخصوص مطالب الفرقان، حصہ سوم) میں، کعبہ، حج، عمرہ اور ان سے متعلق مناسک کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے کہ دین (اسلامی نظام) کے پروگرام میں ان کی اہمیت کیا تھی اور ان سے کس قدر انقلاب آفریں نتائج مرتب ہوتے تھے۔ اور اب (''مذہبِ اسلام'' میں) ان کی حیثیت کیا رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود، میں اس کی تاکید کیا کرتا ہوں کہ (اُن جزئیات کو چھوڑ کر جو قرآن کے خلاف ہوں) ان کا باقی رکھنا کیوں ضروری ہے۔ سردست (کم از کم) ان سے ہمارا ملی تشخص تو قائم ہے۔ ان کے ساتھ، میں یہ بھی تاکید کیا کرتا ہوں کہ ہمیں قرآنی نظام کے قائم کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہئے، جس کا قدمِ اولین وہ تعلیم ہے جس سے قلب ودماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو۔ یہ اس لئے کہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر، قرآنی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ دعا کے مفہوم کے متعلق بھی

میں، مطالب الفرقان میں (دعا اور تقدیر کے عنوانات کے تحت) تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ ان دیارو احصار کی کشش وجاذبیت کا سبب ان کے اینٹ اور پتھر نہیں، بلکہ یہ ہمارے اپنے جذبات کا مظاہرہ ہے۔ جس قسم کے ہمارے جذبات اسی قسم کا ان اینٹوں اور پتھروں کا تاثر، اس نکتہ کی وضاحت کسی دوسرے وقت کی جائے گی۔

کویت:

کویت میں ہمارا قیام، عزیزم عمر دراز خان کے مکان پر ہوا جہاں مجھے اپنے گھر کی سی راحت میسر آ گئی۔ کویت میں میری قرآنی فکر کا چرچا تو ایک عرصے سے ہو رہا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے اس کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے۔ اس آواز کے نقیب احباب میں سے چند ایک سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ باقیوں سے یہاں آ کر ہی ملا اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا ذہن بڑا روشن اور فکر بڑی تاباں ہے۔ عمر دراز صاحب کے مکان پر ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور (یہ دیکھ کر مجھے اور بھی مسرت ہوئی کہ) ان میں خواتین کی تعداد بھی کافی تھی۔ یہ تمام احباب، میرے خطابات اور درس تو (ٹیپ کے ذریعے) مسلسل سنتے چلے آ رہے تھے۔ اس لئے طے یہ پایا کہ (کسی خطاب کے بجائے) سوال وجواب کا سلسلہ زیادہ مفید رہے گا، تاکہ جسے کسی نکتہ کی وضاحت مطلوب ہو۔ کسی شبہ کا ازالہ درکار ہو، کسی اجمال کی تفصیل مقصود ہو، وہ بالمشافہ دریافت کر لے۔ یہ اندازِ افہام وتفہیم بڑا مفید رہا۔ عمر دراز صاحب کے مکان کے علاوہ، دو جگہ اور بھی اجتماعات منعقد ہوئے۔ ایک عزیزم عبید الرحمٰن ارائیں کے مکان پر ___ ان کا نام نوکِ قلم پر آتے ہی ماضی کی چند حسین یادوں کے دریچے کھل گئے۔ غالباً 1950-1951ء میں، میں نے کراچی میں جب درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو اس کی صورت یہ تھی کہ نیپئر بیرکس، فاؤلرز لائن کے مکان کے صحن میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے، دو ایک چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں اور تین یا چار سامعین ان پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان السابقون الاوّلون میں، (ڈاکٹر سعید مرحوم کے علاوہ، جن کے ایماء پر درس کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا) عبدالرحمٰن ارائیں نامی ایک صاحب بھی شریک ہوتے۔ ان کے ساتھ ان کے (چھوٹی چھوٹی عمر کے) صاحبزادے بھی آتے۔ اس ابتداء اور اس کے بعد ان کی تربیت سے ان بچوں کے قلب میں فہمِ قرآنی کا ایسا بیج بو یا گیا کہ وہ وقت کے ساتھ شاخِ ثمردار بنتا چلا گیا۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا، عزیزم عطاء الرحمٰن ارائیں (انجینئر) لاہور میں مقیم ہے اور فکرِ قرآنی کا نہایت متین اور باسلیقہ مبلغ۔ دوسرے دو بیٹے، عبید الرحمٰن ارائیں (انجینئر) اور عتیق الرحمٰن (ڈاکٹر) کویت میں ہیں، اور فکرِ قرآنی سے وابستہ۔ انہی عبید الرحمٰن ارائیں کے مکان پر ایک اجتماع ہوا ___ جس میں اچھے خاصے روشن خیال، اربابِ فکر ودانش شریک تھے۔ ایک اجتماع محترم شفیق صاحب کے مکان پر ہوا، جو سفرِ حجاز میں شریکِ کارواں تھے۔ یہ اجتماع بھی بڑا کامیاب تھا۔ ان اجتماعات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب یہ قرآنی فکر (بفضلہٖ تعالیٰ) اربابِ علم وبصیرت کے دلوں میں گھر کر رہی ہے، اور یہی درحقیقت اس کے صحیح مساکن ہیں۔ اس کا سہرا عزیزم عمر دراز خان، اور ان کے قدیم رفقاء کے سر پر ہے جنہوں نے نہایت التزام اور استقامت سے اس چراغ کو روشن رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی

مساعی میں مزید برکت عطا فرمائے۔

دہران کے قرآنی احباب کو میرے وہاں نہ جاسکنے کا جس قدر افسوس ہوا اس کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ قریب قریب ہر روز ان کی طرف سے ٹیلی فون آجاتا تھا۔ ایک دن تو انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ قریب پندرہ منٹ تک، ٹیلی فون پر، مجھ سے پیغامات حاصل کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے شوقِ فراواں کو مزید شادابی عطا فرمائے۔

کویت کے احباب کا تقاضا تو بے پایاں تھا لیکن میرے لئے مرکز کی طرف جلد از جلد لوٹنا بھی ضروری تھا۔ میاں ظفر محمود صاحب 25 اپریل کی شب، جانبِ کراچی روانہ ہوگئے تاکہ (میرے وہاں پہنچنے سے پہلے) وہاں کے انتظامات کا جائزہ لے لیں۔ میں، احبابِ کویت کو تشنہ کام چھوڑ کر، 26 اپریل کی شب عازمِ) کراچی ہوا۔ ائیر پورٹ پر، ان کے ہجوم نے یہ کہہ کر مجھے اذنِ رخصت دیا کہ

و داع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

کویت سے کراچی کا سفر بڑا کٹھن ہے۔ جہاز رات کو وہاں سے روانہ ہوکر، صبح کے وقت کراچی پہنچتا ہے۔ ایک تو رات بھر کا جگراتا۔ پھر تنہائی (کیونکہ رفیقِ عزیز ظفر صاحب پہلے جا چکے تھے) لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ میرا خدا، ہر مقام پر میری بے کسی کی شرم رکھ لیتا ہے۔ کویت کے قرآنی احباب میں ایک صاحب (محترم عبدالعزیز بھٹی) انگلینڈ سے واپس آئے۔ انہوں نے اپنے وطن (ڈسکہ) جانے کے لئے اسی رات کراچی آنا تھا۔ انہوں نے میری روانگی کا سنا تو اپنے جہاز میں نشست حاصل کرلی۔ اوران کی مشفقانہ رفاقت نے تنہائی محسوس ہی نہ ہونے دی۔ صبح کراچی اترا، تو عزیزم خالد سامنے کھڑا تھا۔

کراچی:

تقسیمِ ہند کے بعد، کراچی میرا پہلا وطن تھا۔ میں نے (پاکستان میں) اپنی قرآنی تحریک کی ابتداء یہیں سے کی تھی۔ 1958ء میں، مستقل طور پر لاہور منتقل ہوگیا تو (پھر بھی) وقتاً فوقتاً کراچی آنا جانا رہا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسے مواقعات پیش آتے رہے کہ (احباب نے بتایا کہ میں) سترہ سال کے بعد کراچی آیا ہوں۔ اس عرصہ میں کراچی کچھ اس طرح بدلی کہ میں اس کے کسی حصے کو بھی پہچان نہ سکا۔ (للہ الحمد کہ قرآنی احباب کے دلوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی) ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کے عزیز، محترم فضل احمد بٹ، کراچی میں مقیم ہیں۔ میں نے انہیں کے ہاں ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ کیونکہ ان کا گھر میرے لئے بمنزلہ اپنے گھر کے ہے۔ عزیزم خالد بھی وہیں تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے اور بھی آرام ملا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، میں نے اپنی تحریک کا آغاز کراچی ہی سے کیا تھا۔ (1958ء میں) جب میں وہاں سے لاہور منتقل ہوا ہوں، تو قرآن کی آواز پھیل رہی تھی لیکن اس کی رفتار قدرے سست تھی۔ اب یہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ یہاں مختلف مقامات پر قرآنی آواز کے مراکز قائم ہوگئے ہیں۔ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کی سرگرمیاں بھی پہلے سے کہیں زیادہ برق پا ہیں۔ میں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ کسی پبلک اجتماع کا انتظام نہ کریں۔ نہ ہی میرے کراچی کے ورود کا چرچا کریں، کیونکہ اس صورت میں میرے لئے کراچی سے دامن چھڑانا مشکل ہوجائے گا۔ لیکن اس کے باوجود، نجی اجتماعات

میں بھی شرکاء کی بڑی کثرت تھی۔ (ریٹائرڈ) میجر جنرل احسان الحق صاحب نے (جن کے ساتھ میرے قدیمی تعلقات ہیں) ایک قرآنی حلقہ قائم کر رکھا ہے جس میں اعلیٰ مناصب پر فائز اربابِ علم و دانش شریک ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی ایک اجتماع ہوا، جس میں خواتین بھی بکثرت شریک تھیں۔ عزیزم منصور ٹبلہ کے ساتھ بھی میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ ان کے ہاں دو اجتماعات ہوئے اور بڑے کامیاب۔ انداز سوال و جواب ہی کا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب سوالات، انکار و اقرار حدیث اور تین نمازوں اور نوروزوں سے آگے بڑھ کر زندگی کے عملی مسائل سے متعلق ہو چکے ہیں۔ بالخصوص اسلامی نظامِ مملکت۔ اسلامی قانون سازی۔ اسلامی حکومت۔ اسلامی نظامِ معیشت سے متعلق۔ خواتین کو اگرچہ برقعہ اور ساڑھی کی کش مکش میں الجھا دیا گیا ہے، لیکن انہوں نے بھی زیادہ تر بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق سوالات کئے۔ مرکز ہر سوال کا قرآن تھا۔

کراچی کے چار دن کے قیام میں، بعض دیرینہ دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں ان کے نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ اگر (سہواً) کسی ایک کا نام بھی لکھنے سے رہ گیا تو انہیں شکایت پیدا ہو جائے گی جو میں قطعاً نہیں چاہتا۔ یہ تمام دوست بڑے مخلص اور میرے لئے یکساں واجب الاحترام ہیں۔ خدا ان سب کو خوش و خرم رکھے۔ ان کے ساتھ میرے ماضی کی بڑی حسین یادیں وابستہ ہیں ــــــ ملازمت کی زندگی تحریکِ پاکستان کی زندگی۔ تشکیلِ پاکستان کی زندگی۔

30 اپریل کی شب، احباب کو باچشمِ نم چھوڑ کر، لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ عزیزم خالد سلمہٗ (بیوی بچوں سمیت) اس سفر میں بھی میرے لئے عصائے پیری تھا۔ دس بجے شب، ائیر پورٹ پر جملہ اہلِ خانہ کو خوش و خرم موجود پایا۔

شکریہ:

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، اس سعادت کے حصول کی آرزو ساری عمر میرے سینے میں مچلتی رہی۔ عمر کے اس آخری حصہ اور صحت کی خرابی، نیز حوادث کے صدمات کی بناء پر، میں اس کی طرف سے اب مایوس ہو چکا تھا، کہ مبداءِ فیض کی کرم گستری نے، یکسر غیر متوقع طور پر ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن سے زندگی کی یہ دیرینہ آرزو، اس حسن و خوبی سے بر آئی جو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے میں بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز ہوں۔ اور اس کے بعد، ان تمام احباب کا بہ صمیمِ قلب شکر گذار جن کی محبت، شفقت اور رفاقت سے یہ مراحل ایسے پُر آسائش طور پر طے ہو گئے کہ مجھے صعوبتِ سفر کا احساس تک نہیں ہوا۔ زندگی میں ایسے پُر خلوص احباب کا میسر آ جانا بجائے خویش، نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیاب و کامران فرمائے۔

اگر اس کا کوئی صلہ ملنا ہے تو میں بحضور ربِ کریم گزارش کروں گا کہ ؎

مرے قافلے میں لٹا دے اسے لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

کہ یہ ماحصل، انہی کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

رہینِ منّت: پرویزؒ

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البقرۃ، آیات 228 تا 233

درسِ قرآن

وَالۡمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ ثَلٰثَۃَ قُرُوۡٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَہُنَّ اَنۡ یَّکۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِیۡۤ اَرۡحَامِہِنَّ اِنۡ کُنَّ یُؤۡمِنَّ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَبُعُوۡلَتُہُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّہِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا ؕ وَلَہُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡہِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیۡہِنَّ دَرَجَۃٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ شَیۡئًا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِہٖ ؕ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَعۡتَدُوۡہَا ۚ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنۡ طَلَّقَہَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَہَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ یُّقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ؕ وَتِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ یُبَیِّنُہَا لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَلَا تُمۡسِکُوۡہُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰہِ ہُزُوًا ۟ وَّاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ وَالۡحِکۡمَۃِ یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡہُنَّ اَنۡ یَّنۡکِحۡنَ اَزۡوَاجَہُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَیۡنَہُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ ذٰلِکَ یُوۡعَظُ بِہٖ مَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکُمۡ اَزۡکٰی لَکُمۡ وَاَطۡہَرُ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَہُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ ؕ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَۃَ ؕ وَعَلَی الۡمَوۡلُوۡدِ لَہٗ رِزۡقُہُنَّ وَکِسۡوَتُہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ لَا تُکَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَہَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَۃٌۢ بِوَلَدِہَا وَلَا مَوۡلُوۡدٌ لَّہٗ بِوَلَدِہٖ ۚ وَعَلَی الۡوَارِثِ مِثۡلُ ذٰلِکَ ۚ فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡہُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا ؕ وَاِنۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَیۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۳﴾

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی 8 تاریخ ہے اور ہم قرآنِ کریم کے درس کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی پچھلی

آیت 227 تک پہنچ گئے تھے‘ 228 سے آج آغازِ کلام ہوگا۔

نوعِ انسانی کے لیے اصول و اقدار کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی نوعیت اور اُن کی خصوصیت:

جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا قرآنِ کریم میں عام طور پر زندگی کے اصول اور اصولی قوانین دیے ہیں۔ اس لیے کہ جس کتاب کو زمان اور مکان کی حدود سے ماورا رہنا تھا یعنی قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطہ حیات بننا تھا‘ اسے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ ابدی اصول اور اقدار اپنے ہاں واضح طور پر دے دیتی کہ اصول اور اقدار میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی اور ان کی روشنی میں جزوی احکام کا تعین اس ملت کی صوابدید پر چھوڑتی کہ وہ اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات بھی وضع کرے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا طریق کار بھی متعین کرے۔ جزوی قوانین قرآن کریم نے بہت تھوڑے سے معاملات میں دیے ہیں اور وہ بھی بیشتر انسان کی عائلی زندگی Family Life کے متعلق ہیں۔ اس لیے کہ عائلی زندگی مثلاً ماں باپ کے رشتے‘ بہن بھائیوں کے تعلقات اور بالخصوص میاں بیوی کے تعلقات‘ اولاد کے ساتھ تعلقات وہ چیزیں ہیں جن میں کہ یہ تعلقات مستقل ہوتے ہیں‘ ان میں تبدیلی نہیں آتی۔ قرآنِ کریم میں بیشتر احکام انہی رشتوں کے متعلق دیے ہیں۔ عائلی زندگی کے متعلق دیے ہیں۔

ازدواجی تعلقات کی اہمیت اور اس کے لیے دیے گئے احکام:

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس نے میاں بیوی کے تعلقات کو لیا ہے کہ ان کے تعلقات کی خوشگواری پر گھر کی فضا کا خوشگوار ہونا موقوف ہے۔ گھر کی فضا خوشگوار ہوتی ہے تو اولاد کی تربیت صحیح ہوتی ہے اور جب یہ ایک یونٹ اپنے ہاں قرآن کے الفاظ میں جنت کی سی زندگی کا ایک نقشہ مرتب کر لیتا ہے تو پھر گھروں کی دیواریں جب گراتے چلے جایئے تو معاشرہ خود بخود جنت کی فضاؤں جھولے جھولتا ہے۔ اس لیے اس نے میاں بیوی کی زندگی کے متعلق قوانین بڑی ہی تفصیل سے عطا کیے ہیں۔ پہلے چیز آئی تھی کہ نکاح کے لیے بنیادی شرط ہم آہنگی فکر و نظر ہے اور اس کے بعد یہ کہا تھا کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک بندھن ہے جو ایک دفعہ باندھ دیا گیا تو خواہ اس کے بعد حالات کیسے ہی کیوں نہ پیدا ہو جائیں اس سے آزادی نہیں ہو سکتی۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ اگر حالات ناخوشگوار ہو جائیں اور نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو یہ جو تم نے باہمی نباہ کا معاہدہ کیا تھا یہ ٹوٹ بھی سکتا ہے لیکن وہ توڑتا بھی بڑے ہی حسین کارانہ انداز سے ہے اور یہی چیز ہے جس کے لیے اس نے جزوی قوانین دیے۔ پچھلی آیت میں یہ تھا کہ پہلے کوشش کرو کہ نباہ کی صورت ہو اور اگر تم نے طلاق کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر اس کے لیے ہم نے قاعدہ مقرر کیا ہے‘ اس کے مطابق پھر طلاق ہو جائے گی۔ طلاق کے بارے میں‘ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے لفظی معنی آزاد ہو جانے کے ہیں اور اس سے مفہوم ہے کہ یہ جو ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا تھا اس معاہدہ کی تنسیخ کا نام طلاق ہے یعنی اس کے ٹوٹ جانے کا‘ علیحدہ ہو جانے کا‘ کالعدم ہو جانے کا نام ہے۔ اسے غور سے سن رکھیے کہ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ اہم چیز کیا ہے؟ ٹھیک ہے طلاق کے معنی ہیں ’’آزاد ہو جانا‘‘ تو پھر اس میں بات کون سی ہوئی؟ ابھی بات

سامنے آجاتی ہے کہ میں کیوں زور دے رہا ہوں۔ اس کے معنی ہیں ''اس معاہدے کا ختم ہو جانا''۔ طلاق اس وقت کہیں گے جب یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے معنی ہی ''آزاد ہو جانا'' ہیں۔ جس طرح عقد کے معنی ہیں ''معاہدے کا طے پا جانا'' معاہدے کے الفاظ دہرا دینے سے یہ عقد نہیں ہوگا بلکہ یہ معاہدہ طے پائے گا تو اس وقت اسے آپ عقد کہیں گے۔ اسی طرح اس عقد کے کھل جانے کا نام 'آزاد ہو جانا' کالعدم قرار پا جانا' منسوخ ہو جانا' جب یہ واقع ہو جائے گا تو پھر اس کو طلاق کہا جائے گا۔ آپ ذہن میں یہ رکھیے گا۔

طلاق کی صورت میں دیئے گئے متعین اصول واقدار

طلاق یافتہ عورت کے بارے میں کہا ہے کہ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ❶ (2:228) طلاق کے بعد عورت ایک متعین مدت تک دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر بہت بڑی مصلحت ہے اور مصلحت خود بتا دی کہ انہیں چاہیے کہ اگر وہ حمل سے ہیں تو اس کا اعلان کر دیں۔ اس کی مدت تین قروء ہے۔ قرء حیض کی مدت کو کہتے ہیں یعنی ایک مہینہ عام طور پر' ایک ماہواری ایام کے بعد دوسرے ماہواری ایام کا جو درمیانی عرصہ ہے' اسے کہتے ہیں اس کو تین حیض کہہ لیجیے اور یہ اس لیے ہے کہ یقینی طور پہ معلوم ہو جائے کہ سابقہ خاوند کا حمل اس عورت سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جو ہونے والا بچہ ہے اس کے حقوق کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ یہ متعین ہو جائے کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ اسی لیے یہ کہا کہ وہ اتنا انتظار بھی کرے اور اگر استقرارِ حمل ہے تو اسے چاہیے کہ اسے چھپائے نہیں بلکہ بات واضح طور پر کہہ دے۔ یہاں یہ کہا کہ تین مہینے کے لیے اسے انتظار کرنا ہوگا۔ اس کو عدت کی مدت کہتے ہیں۔ جیسا میں نے پچھلی دفعہ ❷ کیا تھا کہ طلاق کی بات آئی تھی تو قرآنِ کریم کی طلاق کی تمام آیات آپ کو حوالوں سے لکھا دی تھیں کیونکہ قرآن ایک بات کو ایک جگہ بیان نہیں کرتا' متعدد مقامات میں پھیر پھیر کر لاتا ہے۔ وہ سارے مقامات بیک وقت سامنے آجائیں تو وہ مسئلہ بالکل واضح صاف بین ہو جاتا ہے۔ عدت کے لیے بھی یہ آیات دیکھ لیجیے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ میری چھوٹی سی کتاب ہے ''قرآنی قوانین'' اس میں وہ قرآنِ کریم کے جو تمام قوانین ہیں' وہ دیے ہوئے ہیں۔ میں وہیں سے یہ چیز آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ (2:228) میں کہا گیا ہے کہ اس کے لیے یہ عدت تین قروء ہے اور اسی لیے مسئلہ یہی ہے کہ جب وہ حیض سے فارغ ہو تو اس

---

❶ طلاق یافتہ عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو' (نکاحِ ثانی سے) اتنا عرصہ روکے رکھیں' جتنے میں اُن کے تین حیض پورے ہوں۔ {جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آتا ہو' اُن کی عدت تین ماہ کی ہے (65:4) اور جس عورت کی طلاق' مقاربت سے پہلے ہو جائے' اُس کی کوئی عدت نہیں (33:49)}۔ اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں اِس امر کا اظہار کر دینا چاہیے۔ ان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے وہ اُسے چھپائے رکھیں۔ خدا کے قانون (اللہ اور آخرت) کو مان لینے کے بعد' اس قسم کی جزئیات تک کی پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ [حمل کی صورت میں ان کی عدت وضع حمل تک ہوگی (65:4)]۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص: 86 تا 87)

❷ اس کے لئے دیکھئے مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ البقرہ جلد سوم کا چھیالیسواں باب

وقت جو طلاق ہے وہ متعین کی جائے تا کہ عدت کے دن گننے میں آسانی رہے۔ اگر عورت ایسے مقام پہ پہنچ چکی ہے' سن رسیدہ ہو چکی ہے کہ وہ حیض سے نا اُمید ہے یا کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آ سکا' ایسی بھی تو صورتیں ہوتی ہیں کہ وہ سن رسیدہ بھی نہیں ہوتیں لیکن حیض کی بندش ہو جاتی ہے۔ اگر ایسی صورت ہو تو ان کی عدت تین مہینے کی ہے (65:4) حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے' تین مہینے نہیں ہے۔ بچے کی پیدائش تک ہے (65:4)۔ نکاح کے بعد اگر جس عورت کو ہاتھ نہ لگایا جائے اور اس سے پہلے ہی طلاق واقع ہو جائے تو اس کے لیے کوئی عدت نہیں ہے (33:49)۔ بیوہ عورت کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے (2:234)۔ قرآن نے بیوہ کے متعلق تشریح نہیں کی کہ اگر وہ حاملہ ہو تو کتنی عدت ہے لیکن مطلقہ کے متعلق جو قرآن نے وضع حمل تک کہا ہے تو وہاں سے یہ مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ بیوہ حاملہ ہو تو اس کی عدت بھی وضع حمل تک ہونی چاہیے۔ عدت کے دوران مطلقہ عورت کے رہنے سہنے کا' خورد و نوش کی ذمہ داری' سابقہ خاوند کے اُوپر ہو گی اور اس کا معیار وہی ہو گا جو اس سے پہلے ان کی ازدواجی زندگی میں تھا' (2:241)' (65:1)(65:6-7)۔ اسے اس گھر سے نہیں نکالنا چاہیے۔ عورت کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ اسے وہیں رہنا چاہیے لیکن اگر حالات سازگار نہ رہیں' باہمی مناقشت ہو جائے' تنازع ہو جائے تو پھر کوئی بندش نہیں ہے' وہ دوسری جگہ بھی جا سکتی ہے۔ عورت کی طرف سے اختلاف' شقاق یا تنازع کی صورت میں وہی شکل قرآن نے تجویز کی ہے جو مرد کی صورت میں تجویز کی ہوئی ہے۔ بیوہ کے لیے ایک سال کی خورد و نوش رہائش وغیرہ کا انتظام مرد کے ذمے ہے۔ اگر وہ اس سے پہلے کہیں دوسری جگہ چلی جاتی ہے تو پھر وہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے (2:240)۔

قرآن حکیم نے بیوہ ہونے کی صورت میں اسے اسی گھر میں رہنے کو سہولت کے طور پر بیان کیا ہے:

یہ جو کہتے ہیں کہ خاوند کے مرنے کے بعد یہ بیوہ' جس گھر میں' جس کوٹھڑی میں' جس مکان میں ہے' وہ چار مہینے دس دن تک وہاں سے نکل ہی نہیں سکتی یہ غلط ہے۔ سوال پابند مسکن ہونے کا نہیں ہے۔ یہ تو قرآن نے سزا کے طور پر تجویز کیا ہوا ہے' سورۃ النسآء میں ہم دیکھیں گے تو اس بیچاری کو سزا نہیں ملتی۔ کہا تو یہ تھا کہ اس کو اس گھر سے نکالا نہ جائے' وہ بھی اس گھر سے نہ نکلے' وہیں رہے۔ اس کے ساتھ بچے ہیں' وہ خود ہے تو اس صورت میں وہاں وہ جہاں رہ رہی ہے بشرطیکہ وہاں کی فضا سازگار ہو' فضا سازگار نہ ہونے کی صورت میں اور بات ہے لیکن وہ یہ چیز نہیں ہے کہ اس کو یہ سزا ملی ہوئی ہے کہ وہ اتنے دن گھر سے باہر قدم نہ رکھے۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج ہے کہ وہ کسی ضرورت کے لیے بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی' جس گھر میں بھی اس کے خاوند کا انتقال ہوا ہے۔ قرآنِ کریم کا یہ منشا نہیں ہے۔ یہ عدت کے متعلق قرآن نے کہا وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ (2:228) اس دوران میں' ابھی بات آئے گی کہ کون سا عدت کا یہ وقت تھا' یہ جو وقت ہے' جس میں اس نے ابھی دوسری جگہ نکاح نہیں کیا' اگر خاوند نے اس کو چھوڑا تھا' طلاق دی تھی تو اس کے لیے یہ چیز کوئی ممانعت کی نہیں ہے کہ وہ

دوبارہ بھی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں اس کا حق فائق ہے۔ اگر یہ چاہے اور بڑی شرط یہ ہے کہ عورت کی بھی رضامندی ہو۔

کوئی مرد کسی عورت کا زبردستی مالک نہیں بن سکتا

نیز حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق:

یاد رکھیے! عورت کی رضامندی کے بغیر کسی صورت میں نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ حلال ہی نہیں ہے کہ تم کسی عورت کے وارث بن جاؤ کہ اسے کراہت ہو اور تم اس کے مالک بن جاؤ۔ باہمی رضامندی سے ہی یہ معاہدہ قرار پاتا ہے اور دیکھیے درمیان میں قرآن چار لفظ لایا ہے۔

عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ صاحب! اسلام نے عورت کو حقوق دیے۔ حقوق کے بعد جب ہم ان مسائل پہ جاتے ہیں جو زندگی میں بڑھتے جاتے ہیں تو وہاں نظر آتا ہے تو پہلی چیز یہ ہے کہ مردوں کو حاکم بنایا ہے عورتوں کے اُوپر۔ تو اب بتائیے کہ اس کے بعد محکوم کے حقوق کیا ہوتے ہیں؟ پھر حقوق کی فہرست مرتب کی جائے۔ قرآنِ کریم کے چار الفاظ ہیں' برادرانِ عزیز! اور جہاں تک میری نگاہ گئی ہے' کہیں اس قسم کے الفاظ نہ مجھے دیگر مذاہب کی مبینہ مذہبی کتابوں میں ملے ہیں' نہ کسی اور جگہ جو قرآن نے کہا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (2:228) چار الفاظ میں کتنی جامعیت سے بات کہہ گیا ہے کہ یاد رکھو! جو ذمہ داری عورت پہ عائد ہوگی ایک ذمہ داری کے مقابلے میں اس کا ایک حق ثبت (Establish) ہو جائے گا۔ ہر Responsibiliy کے مقابلے میں' ہر Liability کے مقابلے میں' ایک Acrue Right ہو جائے گا۔ کیا بات ہے صاحب! یہ ہے عائلی زندگی میں خدا عدل کا ترازو لیے ہوئے بیٹھا ہوا۔ جتنی ذمہ داریاں عائد کرو' اس کو اتنے حقوق دینے ہوں گے۔ یہ ہے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق یہاں ذمہ داریاں ساری کی ساری عورت کی ہیں' حقوق سارے کے سارے مرد کے ہیں' یہ حاکم واقع ہوئے ہیں۔ پھر وہ آگے بڑھتے ہیں تو روایات آتی ہیں کہ اگر کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ کہتا کہ عورت مرد کو سجدہ کرے۔ پھر مرد یعنی خاوند عورت کا مجازی خدا تو ہے ہی۔ پھر یہ میاں ہے یعنی اس کے بعد اللہ میاں ہے اور یہ میاں ہے۔ تو اس کے بعد حقوق تصور نہیں ہو سکتا۔

چار چار شادیوں کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی شرط کا تذکرہ نہ کرنا' قرآن کے خلاف ایک عجیب جسارت ہے

عزیزانِ من! حقوق کا تصور تو ان چار لفظوں [1] میں ہوگا صاحب! ہر ذمہ داری کے مقابلے میں ایک حق ہے۔ کیجیے فہرستیں مرتب لیکن ہمارے ہاں تو ہوتا یہ ہے' عجیب چیز ہے' قرآن کے ساتھ جو کیا جاتا ہے' قرآن کی آیت کے ایک ٹکڑے کو

---

[1] یہ اس طرف اشارا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (2:228) قانونِ خداوندی کی رُو سے' مرد اور عورت کے حقوق و فرائض یکساں ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص:87)

الگ کرلیا جاتا ہے۔ وہ جو آپ کو ایک آیت تین تین چار چار بیویاں کرنے کے سلسلے میں سنایا کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آیت بھی یہاں سے پڑھی جاتی ہے' نکاح نامے کے جو فارم چھپے ہوئے ہوتے ہیں' ان پہ میں نے دیکھا ہے کہ آیت یہاں سے لکھی جاتی ہے۔ کہاں سے لکھی جاتی ہے؟ یہاں سے کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ (4:3) عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہیں دو دو تین تین چار چار شادی کرلو۔ نکاح کے وقت یہاں سے یہ آیت پڑھی جاتی ہے' نکاح نامے کے اُوپر یہاں سے یہ آیت لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ تھوڑی سی عربی جاننے والا بھی یہ جانتا ہے کہ یہ جو فَانْكِحُوْا میں ف ہے اس کے معنی ''تو'' ہے تو اس سے پہلے اگر ہوگا یعنی شرط پہلے ہوگی تو اس کے بعد جزا ہوگی فَانْكِحُوْا کے معنی ہیں تو تم ایسا کرو۔ کیا کبھی کوئی فقرہ ایسا شروع ہوتا ہے جو ''تو'' سے شروع ہو اور پہلے اس کے اگر نہ ہو؟ لیکن یہ یہاں سے یہ آیت شروع کرتے ہیں یہ ابتدا نہیں ہے یہ آیت کا درمیان ہے' یہ اس سے پہلے شرط موجود ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ (4:3) اور اگر' یہ دیکھئے پہلے اگر آیا۔ جملہ سوچیے تو بنتا ہی اس طرح سے ہے کہ شرط پہلے ہوتی ہے' جزا اس کے بعد ہوتا ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ (4:3) یہ کبھی نہیں پڑھیں گے' یہ کبھی نہیں لکھیں گے۔ قرآن کی آیت کے متعلق یہ کچھ آپ کے ہاں ہوتا ہے' دھڑلے سے ہوتا ہے' ۃ محفلوں میں ہوتا ہے' لکھا ہوا ہوتا ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ (4:3) اگر تمہیں اس چیز کا ڈر ہو کہ وہ جو عورتیں خاوند کے بغیر رہ گئی ہیں' حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ بیوائیں اتنی رہ گئی ہیں یا ان کے بچے ہیں کہ جن کا معاملہ تم کسی طرح سے بھی حل نہیں کر سکتے اور انصاف سے طے نہیں کر سکتے تو پھر اس کی ایک شکل یہ ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے ان کو نکاح میں لا کر ان کی حفاظت کا سامان کر دو اور پھر آگے اگلی شرط یہ چیز ہے کہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4:3) اور اس پہ اگر تم دیکھو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر وہ وہی ایک والا قانون رہے گا۔

دوسری شادی کے سلسلہ میں حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے

قرآن ہے عزیزانِ من! اس عمدگی سے کہہ گیا کہ قانون تو ایک ہی کا ہے لیکن اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو گئے ہنگامی معاشرے میں جیسے کہ جنگ کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر اسلامی سوسائٹی کے اندر یہ صورت واقعی خطرناک شکل اختیار کر جاتی ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی ہی نہیں کر سکتی' نہ کافر سے' نہ مشرک سے' نہ اہل کتاب سے۔ مختصر سی ایک جماعت مدینے میں ہے' جنگ شروع ہو جائے' جنگ میں جو نوجوان ہیں وہ کام آتے ہیں۔ وہ جنگ میں کام آنے شروع ہو گئے' مرد کم ہو گئے' عورتیں زیادہ ہو گئیں۔ مکے سے مسلمان عورتیں اپنے کافر شوہروں کو چھوڑ کر بھاگ کر مدینے آ گئیں۔ یہ Situation (صورت حال) پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے میں یہ کمیونٹی کیا کرے؟ یہ عورتیں کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتیں۔ مسلم کمیونٹی کے مردوں کی تعداد کم ہو رہی ہے' عورتوں کی تعداد اتنی بڑھ رہی ہے۔ اس کے لیے ایک ہنگامی صورت پیدا کی تھی کہ اگر تمہیں یہ خطرہ لاحق ہو جائے کہ ان کے مسئلہ کا کوئی معقول اور مناسب حل نہ ملے تو ایک سے زیادہ چار تک شادیاں کر سکتے ہیں لیکن اگر You will not be able to do justice to them (تم ان سے عدل نہیں کر سکو گے) تو پھر صرف ایک

شادی کا ہی قانون ہوگا۔ یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔ کتنا عجیب جامع لفظ ہے۔ عورت کے ساتھ Justice (انصاف) میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ شامل ہے۔ اس صورت میں اگر معاشرہ چاہے تو اس مشکل کا یہ ایک حل ہے لیکن اس میں بھی یہ دیکھ لو کہ گھر کو جہنم نہ بنالو تَعْدِلُوْا (4:3) کے معنی یہی نہیں ہیں کہ آنے والی بیوی سے تم عدل نہیں کر سکو۔ جو پہلے رہنے والی ہے اس سے عدل نہیں ہوا تو وہ کیا کرے گی صاحب؟ اس سے تو عدل اسی صورت میں ہوگا کہ اس کی رضامندی سے ایسا ہو ورنہ پہلے دن سے ہی غیر عدل کی شکل پیدا ہو جائے گی لیکن میں جب سورۃ نس آء پہ آؤں گا۔ وہاں عرض کروں گا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے کرتے یہ ہیں کہ قرآن کی آیتوں کے اندر سے چار لفظ ٹکڑے لے کر کہ دیکھیے صاحب! قرآن نے یہ کہہ دیا ہے۔

عورتوں پر مردوں کی فضیلت کی وضاحت اور نوعیت

اسی طرح سے یہاں ہوتا ہے کہ واہ صاحب! آپ نے کہہ دیا کہ یہاں مساوات ہے' حقوق اور ذمہ داریاں برابر ہیں!! یعنی آپ نے کہہ دیا گویا یہ جو چار الفاظ تھے یہ تو قرآن میں' میں نے داخل کیے تھے اور اگلے چار لفظ ان کے قرآن میں تھے' وہاں سے بات آ گئی۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط (2:228) دیکھو صاحب! قرآن کہتا ہے مردوں کو ان کے اُوپر فضیلت حاصل ہے' افضلیت حاصل ہے' درجات حاصل ہیں۔ ساری آیت پڑھو تو بات ثابت ہو جائے۔ وہ کہتا ہے طلاق کی صورت میں فریقین اس معاہدے سے آزاد ہو گئے۔

اب یہاں عورت پر ایک پابندی عائد کی جا رہی ہے کہ وہ تین ❶ مہینے تک نکاح نہیں کر سکتی۔ اس پابندی کی مصلحت بتائی جاتی ہے۔ مرد کے لیے تو یہ چیز ضروری نہیں ہے جس کے لیے یہ چار مہینے لگائے ہیں عورت کے لیے ہے۔ وہ تو اس لیے تھا کہ اس کا یقین ہو جائے کہ حمل نہیں ہے۔ مرد کی صورت میں تو ضرورت نہیں تھی اس لیے مرد پر یہ عدت کی پابندی لگائی نہیں گئی۔ کہا یہ کہ عورت کے اُوپر یہ پابندی ہے ان کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں ہیں۔ بس یہ ایک معاملہ ہے جس میں مرد کو یہ Advantageous Position (سودمند حیثیت) حاصل ہے۔ دَرَجَةٌ ایک معاملہ ورنہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! اگر یہ صورت ہے تو پھر اس پہ بھی عدت لگائیے۔ یہاں آیت آئی ہے کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط (2:228) اس معاملے ایک ایسی چیز ہے جسے تم کہہ سکتے ہو کہ مرد کو کچھ Advantageous Poisiton (سودمن حیثیت) حاصل ہو گئی عورت کے معاملے میں۔ جہاں یہ ہو رہی ہے وہاں بھی قرآن بتا رہے کہ دَرَجَةٌ یہ ایک درجہ' ایک چیز ہے' جس کے اندر قرآن نے اس کو یہ فضیلت دی ہے Advantageous Position (سودمند حیثیت) دی ہے۔ ورنہ اصول یہی ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ

---

❶ طلاق یافتہ عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (نکاحِ ثانی سے) اتنا عرصہ روکے رکھیں' جتنے میں ان کے تین حیض پورے ہوں (جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آتا ہو' ان کی عدت تین ماہ کی ہے (65:4) اور جس عورت کی طلاق مقاربت سے پہلے ہو جائے' اس کی کوئی عدت نہیں (33:49)۔ اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں اس امر کا اظہار کر دینا چاہیے۔ ان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے وہ اسے چھپائے رکھیں۔ خدا کے قانون (اللہ اور آخرت) کو مان لینے کے بعد' اس قسم کی جزئیات تک کی پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ (حمل کی صورت میں ان کی عدت وضع حمل تک ہوگی (65:4)؛ (2:228)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص: 86 تا 87)

عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ❶ (2:228) قرآن کی رو سے قاعدے قانون حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوں گی۔ بس ایک ایسی چیز ہے کیونکہ عدت کا بیان آ رہا تھا نا' مرد کے لیے عدت بھی نہیں ہے' خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ اللہ میاں رعی کر گیا۔ کیونکہ ''اللہ میاں دے متعلق وی تے تصور کچھ ایسا ای اوندا اے کہ یعنی اے عورت تے نئیں ذہن اچ اوندا مرد ای ذہن اچ اوندا ہیگا'' ❷۔ حالانکہ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ کہیں ہماری بیٹیوں کے ذہن میں یہ نہ آ جائے کہ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ (112:3) کہہ دیا تھا کہ تم اس قسم کی کوئی چیز ذہن میں نہ رکھنا۔ یہ تذکیر و تانیت کا سوال ہی وہاں پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آپ دیکھتے ہیں مردوں کا دیا ہوا جو تصور ہے آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی خدا کا ذکر آتا ہے اس کے لیے مذکر کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ تو اس نے وہیں یہ چیز کہہ دی کہ ایسی بات نہیں ہے بس یہ ایک معاملہ ہے کہ اس کے لیے عدت نہیں ہے۔ وہ تم سمجھتے ہو کہ تمہیں اس کے لیے ہم نے نہیں رکھا'' کچھ رعی کرن والی گل نئی ہیگی'' ❸ بس وہاں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (2:228) پابندیاں عائد کرنے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ حکمت پر پابندیاں ہیں جو عائد کر رہا ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں طلاق کا طریق کار:

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ طلاق کے متعلق جو حوالے اور قوانین ہیں میں نے عرض کر دیے تھے۔ اب وہی آیتیں آتی ہیں کہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ (2:22) یہ ترجمہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق ایسی ہے کہ جس کے بعد قاعدوں کے مطابق روکا جا سکتا ہے' نکاح میں رکھا جا سکتا ہے' حسن سلوک سے آزاد کیا جا سکتا ہے۔ بات آسان ہے۔ الطلاق: طلاق کے معنی آپ نے سمجھ لیے کہ یہ جو عقد نکاح ہے' اس سے آزادی حاصل ہو جانا' اس کا فسق ہو جانا' اس کا کالعدم ہو جانا' عورت و مرد کا اس عقد سے آزاد ہو جانا۔ میں نے پچھلی دفعہ تفصیل سے یہ سمجھایا تھا کہ بات کیا تھی؟ طلاق کے لیے ایک قاعدہ مقرر ہے' پروسیس مقرر ہے۔ میاں اور بیوی کے ہاں سے حکم مقرر ہوں گے۔ وہ آپس میں بیٹھیں گے ایک

---

❶ عورتوں کے لئے' از روئے معروف' ان ذمہ داریوں کے مطابق حقوق ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اُسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ بلحاظ حقوق و فرائض ان میں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ دونوں مساوی ہیں لیکن اس کے بعد ہے کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (2:228) مردوں کو ایک بات میں ان پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ ایک بات کیا ہے؟ اس کا ذکر خود اس آیت میں موجود ہے۔ طلاق کے بعد عورت کے لئے عدت کی معیاد مقرر ہے جس میں وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی لیکن مرد کے لے ے عدت کی کوئی قید نہیں۔ یہ نہیں کہ مرد (Men) عورتوں (Women) کے مقابلہ میں افضل (Superior) ہیں۔ آپ تاریخِ انسانیت پر غور فرمایئے۔ عورتوں اور مردوں کے سلسلہ میں ہر جگہ ''عَلَيْهِنَّ'' نمایاں طور پر دکھائی دے گا یعنی مردوں کے حقوق ہی حقوق ہوں گے اور عورتوں کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں۔ عورت کا کوئی حق نہیں تسلیم کیا جائے گا۔ یعنی عورت کسی بات کو مرد سے بطور استحقاق (As of Right) طلب نہیں کر سکے گی۔ یہ انقلاب آفریں آواز آپ کو قرآن کی عدالت سے بلند ہوتی سنائی دے گی کہ عورت کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح مرد کے۔ اور اس بات میں دونوں برابر ہیں۔ جس قسم کے مردوں حقوق عورتوں پر (عَلَيْهِنَّ) اسی قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لَهُنَّ)۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960ء' ص: 644 تا 645)۔

❷ اللہ میاں کے متعلق بھی تو تصور ایسا ہی ہے یعنی یہ کہ عورت ذہن میں نہیں آتا ہے۔ مرد ہی ذہن میں آتی ہے۔ ❸ کچھ رعایت دینے والی بات نہیں ہے۔

ثالث ہوگا‘ مصالحت کی کوشش کریں گے‘ ناکامی کی صورت میں فیصلہ دیں گے۔ اس وقت یہ عقد کا رشتہ‘ جو معاہدہ ہے‘ یہ کالعدم قرار پائے گا۔ اس وقت جب یہ کالعدم قرار پائے گا تو اسے طلاق کہا جائے گا۔ ایک دفعہ زندگی میں میاں بیوی کی یہ صورت ہوئی قرآن نے کہا پھر بھی گنجائش ہے‘ دوبارہ بھی میاں بیوی بن سکتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ ایک دفعہ پھر دوبارہ ایسی صورت واقع ہو گئی‘ یعنی دوبارہ یہی پروسیس دہرایا گیا‘ دوبارہ پھر یہ جو عقد ہے‘ فسخ ہوا‘ دوبارہ پھر یہ اس معاہدہ سے آزاد ہو گئے۔ یہ دو مرتبہ ہو گیا۔ کہا کہ دوسری مرتبہ بھی اس کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ میاں بیوی ہو سکتے ہو اور اس کے ساتھ کہا کہ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ تم روز بار بار یہ دہراتے چلے جاؤ اور بار بار پھر یہ بنتے چلے جاؤ۔ دو مرتبہ کی گنجائش بھی کوئی کم گنجائش نہیں‘ اتنی ہم نے دے دی‘ اس کے بعد اگر تم نے اس کو دہرایا تو پھر کوئی گنجائش نہیں تمہارے لیے۔ بات صاف ہو گئی کہ دو مرتبہ کی الطلاق میں یہ گنجائش ہے۔

ہمارے ہاں طلاق پر عمل پیرائی کا طریق نیز ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہ ہے قرمان۔ ہمارے ہاں کیا چیز ہے؟ کہ صاحب! اگر ایک بار یا دو بار لفظ طلاق کہہ دیا: طلاق طلاق‘ اس میں تو گنجائش ہے اور اگر تین دفعہ یا بار یہ لفظ کہہ دیا تو بس پھر گنجائش نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قانون کی بات ہو رہی ہے۔ کیا یہ چیز ہے کہ قانون کا جو ایک لفظ ہے اگر دو دفعہ کہا جائے تو کوئی بات نہیں ہے‘ تین دفعہ اس لفظ کو کہہ دیا جائے‘ کیا یہ قانون ہوگا خدا کا بنایا ہوا قانون؟ کہ پھر گنجائش نہیں ہے۔ یہ ہیں ہمارے وہ قوانین جن کو غیر مسلم دیکھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ہیں قوانین جنہیں آپ کہتے ہو کہ خدا نے ہمارے ہاں ابدی قوانین دیے ہوئے ہیں اور ساری دنیا کے قوانین سے وہ اعلیٰ اور افضل اور بلند مرتبہ ہیں۔ یہ ہے وہ چیز کہ دو مرتبہ ایک لفظ دہرایا جائے تو خیر کوئی بات نہیں ہے اور تین مرتبہ اگر وہی لفظ کہہ دیا جائے تو پھر وہ معاملہ ختم ہوا۔ نیلام کرنے والے کی طرح ون ٹو جاتا ہے تین دفعہ۔ عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے اور عجیب چیز ہے‘ قرآن ہے‘ عزیزانِ من! خدا کا کلام ہے‘ اسے معلوم تھا کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ دو ہی آیتیں بعد قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ (2:231) دیکھنا خدا کی ان آیات اور قوانین کو کہیں مذاق نہ بنا لینا۔ یہیں کہا ہے‘ یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔ دو مرتبہ کی یہ صورت ہے۔ تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آجائے تو اس کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکیں گے کہ پھر سے میاں بیوی کے تعلقات قائم کر لیں (4:19)۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ (2:229) تم طلاق دینے لگے ہو‘ تو یہ غلط بات ہے کہ تم جو اس سے پیشتر‘ مہر کی صورت میں‘ عطیے کی صورت میں اور کچھ زیورات کی صورت میں‘ اسے دے چکے ہو تو وہ اس سے چھیننا شروع کر دو‘ یہ غلط بات ہے لیکن اب یہ معاشرے کے لیے ہے‘ وہ جو ایک ثالث کمیٹی اس کے لیے بیٹھی تھی‘ اگر تم دیکھو کہ یہی چیز اس معاملے میں روک بن رہی ہے تم دیکھ سکتے ہو کہ میاں بیوی رہ کے جو اللہ نے حدود مقرر کیے ہیں ان پہ وہ قائم نہیں رہ سکتے اور یہ کچھ لینے دینے کا معاملہ اس کے درمیان میں آڑے آ رہا ہے تو یہ چیز ایسی نہ ہو جائے کہ اس معاملے کو

حل کرنے کے راستے میں سنگ گراں بن جاؤ' نہیں۔فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِہٖ ؕ (2:229) عورت کو یہ کچھ دیا تھا تو کہا ہے کہ اگر ایسی صورت ہو' معاشرہ یہ دیکھے کہ عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہو رہا ہے' بغیر دیے ہوئے یہ معاملہ طے نہیں ہو رہا تھا تو ٹھیک ہے تم اسے کہہ سکتے ہو کہ جو کچھ دیا تھا اس میں سے کچھ وہ واپس دے دے۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ اس میں کتنی بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ نکاح کے وقت خاوند مہر کی شکل میں' مہر بھی تحفہ ہوتا ہے' گفٹ کی شکل میں اس عورت کو دیتا ہے۔ اب اس قانون کو Abuse کیا جا سکتا ہے۔ وہ جو Abuse کرنے والی ہو' آج اس نے ایک نکاح کیا' پچاس ہزار روپیہ مہر تھا' اسے وصول کیا' نہ بھی کیا تو ہفتے بھر کے بعد طلاق مل جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسری جگہ نکاح کیا۔ میں یہ Abuse کرنے والیوں کا کہہ رہا ہوں۔ تو قانون دینے والا جو خدا ہے' وہ ان راستوں کو بھی بند کرتا ہے۔ کہا کہ یہ صورت نہ ہو کہ کوئی یہ اس قسم کا قصہ شروع کر دے۔ ایسی صورت میں یہ مجاز ہے: ثالث' یہ حاکم' یہ عدالت' یہ فیملی کورٹ' وہ یہ طے کرے کہ نہیں کوئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی ہے اور تم تو اس غرض کے لیے یہ کچھ کر رہی ہو اس لیے ٹھیک ہے وہ تمہیں واپس دینا ہوگا۔ یہی مشکل ہے جس کے لیے کہا کہ اگر تم دیکھو کہ وہ حدود اللہ کی پابندی نہیں کر سکیں گے تو اس صورت میں تم عورت سے یہ کہہ سکتے ہو کہ کچھ تم واپس دے دو' پھر معاہدہ فسخ کر دو۔

عورت کو ناکردہ گناہ کی سزا کس لیے؟ کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی

اب ہمارے ہاں یہ صورت ہے کہ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ جس وقت جب جی چاہے بغیر کسی قسم کا کوئی Reason دیے ہوئے' کوئی وجہ بتائے' کوئی سبب بتائے' طلاق طلاق اور طلاق تین مرتبہ کہا اور معاملہ ختم ہوا۔ اس کے بعد دوبارہ ان کا نکاح' وہ جو میں نے عرض کیا تھا بار بار دہرانا اچھا نہیں لگتا' بزم میں میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں' وہ جسے آپ حلالہ کہتے ہیں' ہوگا۔ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ جب جس وقت جی چاہے' ذرا سا غصہ تاؤ میں آیا کہ ہنڈیا میں نمک زیادہ پڑا' طلاق طلاق طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد یہ بے گناہ بیچاری رو رہی ہے۔ عورت کے اُوپر ظلم پہ ظلم ہو رہے ہیں' اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو معاہدہ اس کی مرضی سے' اس طرح سے طے ہوا تھا' وہ اپنی مرضی سے توڑ دے' یہ جائے عدالتوں میں۔ یعنی مرد کے لیے اگر یہ رکھا جاتا تو پھر بھی یہ بات تھی کہ روز عدالتوں میں یہ جاتے ہی ہیں۔ یہ بیچاری پردہ نشین گھر میں بیٹھنے والی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس کی تو حالت یہ ہے کہ یہ بیچاری اپنا Cause بھی اچھی طرح سے وہاں Plead نہیں کر سکتی۔ اسے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جاؤ کچہری' میاں صاحب گھر میں کھڑے کھڑے طلاق طلاق طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا اور جب پھر وہ کچہری والا معاملہ ہوتا ہے تو اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ کو اور مجھے سب کو معلوم ہے۔ کیا خدا یہ اس قسم کے قوانین دے گا؟ جس کے متعلق خود اس نے یہ کہا ہے کہ اس کو تو مرد نے اس حالت میں رکھا ہوا ہے کہ یہ بیچاری دوسرے مرد کے سامنے اپنا قصہ بیان نہیں کر سکتی۔ بات بھی یہ ٹھیک ہے تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَعۡتَدُوۡہَا ۚ (2:229) یاد رکھو! یہ ہم نے حدیں باندھ دی ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو۔ سنیے! وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾ (2:229) جو ان

حدود سے تجاوز کریں گے، ظلم کریں گے۔ دیکھا آپ نے آج معاشرے میں عورت کے اُوپر کتنا ظلم ہوتا ہے۔ یہ سب کا سب حدود اللہ سے تجاوز ہوا ہوا ہے۔

دو مرتبہ طلاق ہونے کے بعد کا سوال؟

اگر میاں بیوی کی ازواجی زندگی میں دو مرتبہ کی طلاق ہو جائے اور تین مرتبہ کا نکاح ہو چکا ہو تو کہا کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا (2:230) دو دفعہ معاہدے کے فتح ہو جانے کے بعد گنجائش باقی ہے اور اگر دو کے بعد آگے پھر نوبت آ گئی ہے، اگر یہ صورت پیدا ہوئی ہے تو فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ (2:230) ہاں! اس نے کہیں کسی اور مرد سے پھر شادی کر لی، زمانہ گزر گیا، بیوی ہو گئی یا وہاں سے بھی اس کی طلاق کی نوبت آ پہنچی۔ اس دوران میں آپس کے تجربے نے بتایا کہ نہیں! یہ نکاح بہتر تھا۔ کہا کہ اب پھر اس کی گنجائش نکلی۔ ابدی طور پر وہ بالکل نہیں دھتکارتا، قانونی پابندیاں عائد کرتا ہے تا کہ اصلاح کی شکل نکلتی آئے۔ یہ تھی وہ چیز جس کے لیے کہا کہ تین دفعہ یہ طلاق کہہ دیا اور اس کے بعد پھر (معاذ اللہ) چھوڑ دیے قصہ، آپ کو پتہ ہے، میں نہیں دہرانا چاہتا۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (2:231) وہی دو دفعہ کی طلاق کا قصہ جس میں واپسی کی گنجائش ہے۔ اگر وہ اپنی عدت کی مدت پہ پہنچانا چاہتی ہیں تو اس کے بعد پھر یہ چیز فیصلے کر دینے کی ہے۔ رکھنا چاہتے ہو، قانون کے مطابق میاں بیوی رہنا چاہتے ہو، اس صورت میں میاں بیوی رہ سکو۔ حسن سلوک سے چھوڑنا چاہتے ہو تو اس کو حسن سلوک سے چھوڑ دو۔ یہاں چھوڑتے وقت بھی حسن سلوک ہے۔

باہمی تعلقات کے منقطع ہونے پر بھی حسن کارانہ تعلقات کو نظر انداز نہیں کرنا

یہ تو میاں بیوی کا آپس میں چھوڑنا ہے، عزیزانِ من! وہ تو کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی، مکے کے قریش رسول اللہ ﷺ اتنی اذیت دے رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ وقت آ رہا ہے جب ان سے قطع علائق کیا جائے گا، قطع تعلق کیا جائے گا، وہاں بھی کہا گیا ہے کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ (73:10) تعلقات حسن کارانہ رکھنے کا تو رہا ایک طرف، اس نے تو کہا ہے کہ تعلقات منقطع کرو تو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے منقطع کرو ورنہ تعلقات کے منقطع ہونے میں وہ تو آپ کو معلوم ہے، پنجابی میں کیا کہہ گیا ہے کہ ''میری لگدی کسے نہ ویکھی تے ٹٹدی نوں جگ جاندا[1]'' یہ ٹوٹنا ہمارے ہاں کا تو پھر ایسا تماشہ Create کرتا ہے۔ قرآن ہے عزیزانِ من! وہ تعلقات منقطع کرنے میں بھی کہتا ہے کہ جَمِيْلًا شریف انسان کا کام یہ ہے، نہیں نبھا ہوا، تعلقات منقطع ہو رہے ہیں، شرافت کو چھوڑ کے حیوانی درجے پہ کیوں آتے ہو، حسن کارانہ انداز سے تعلقات کا انقطاع کرو۔ تو میاں بیوی کے تعلقات جو ہیں وہ حسن کارانہ انداز سے کیوں نہیں ہوں گے۔ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ (2:231) یا قاعدے کے مطابق انہیں رخصت کر دو۔ دیکھیے! یہ دوبارہ تم نے نکاح میں لانا

---

[1] جب رشتہ طے ہوا، ملاپ ہوا تو کسی کو خبر نہ ہوئی اور جب رشتہ منقطع ہوا تو اس قدر چرچا اور رسوائی ہوئی کہ اسے سارا عالم جانتا ہے۔

ہے' میاں بیوی کی حیثیت اختیار کرنی ہے' تو اس نیت سے نہ کرو کہ ان پر زیادتی کر کے انہیں تکلیف پہنچائی جائے اور کہو کہ اچھا ایک دفعہ تو نکل آواں اب کے آ!''فیر تینوں سٹ لاں گا ❶''۔ کہتا ہے اس نیت سے دوبارہ نکاح نہ کرو ان عورتوں سے۔

لفظ زوج کا قرانی مفہوم

میاں بیوی اور ان کے تعلقات کی بنیاد اس حسن کارانہ انداز کے اُوپر ہو۔ کہتا ہے تم سمجھ کیا رہے ہو! یہ تو تعلقات ہی ''زوج'' کے ہیں اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ زوج کہتے ہی ان دو چیزوں کو ہیں کہ ''دونوں کے ملنے سے ایک اکٹھی چیز بنے''۔ ان میں سے اگر ایک رہ جائے یا ایک ناقص ہو جائے کہ بات آگے ہی نہ چلے۔ گاڑی کے جو دو پہیے ہوتے ہیں' وہ ایک دوسرے کے زوج کہلاتے ہیں۔ اتنا ان کا صحیح' برابر کا ہونا ضروری ہے' ایک جیسا ہونا ضروری ہے۔ ایک پہیہ' دوسرے پہیے سے ذرا سا چھوٹا کر دیجیے اور گاڑی کو چلایئے !! پھر دیکھئے کہ ہوتا کیا ہے۔ یہ چھوٹا ہونا تو ایک طرف رہا' یہاں تو بنیاد ہی آپ تعلقات کی رکھتے ہیں یعنی عورت کو آپ نے ہمیشہ عورت کو چھوٹا پہیہ قرار دیا۔ پھر جو گاڑیاں چلتی ہیں آپ نے تو دیکھ لیا کہ چھوٹا تو ایک طرف رہا اگر صورت یہ ہو جائے کہ ایک پہیہ گول ہو' دوسرا چوسرا ہو'' تے دیکھو چورا ہے تے اوس گڈی دا حال' جو کچھ ہو یا ہونداا ے ❷''چوراہے میں دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ عزیزانِ من! ہر گھر میں وہ گاڑی دیکھئے کہ کیا ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ تو ان بیچاریوں کا صبر ہے کہ ہم نے ان کو اس پوزیشن میں باندھ کر رکھا ہوا ہے کہ

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

گھریلو زندگی کو جنتی ماحول عطا کرنے کا طریق

وہ اُف نہیں کر سکتی لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ان پہ ظلم کر کے ان کا کچھ بگاڑا ہے' کم بختو! آدھی آبادی انسانیت کی جن کو آپ اس حالت میں رکھتے ہیں پھر انسانیت آگے قدم بڑھا کیسے سکے گی؟ تو جو عذاب ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں' ان میں بیشتر وجہ یہ ہے! گھر میں مساوات کی زندگی' تعظیم کی زندگی' احترام کی زندگی' ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کی زندگی' بسر کیجیے۔ دیکھئے! اس میں آپ کے گھر کا نقشہ کیا ہوتا ہے' آپ کو کتنا سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے' بچوں کی تربیت کیسے ہوتی ہے' باہر کے معاشرے میں آپ کی Balanced Personality (متوازن شخصیت) کیا چیزیں پیدا کرتی ہیں! یہاں تو مصیبت یہ ہوتی ہے کہ صبح بیوی سے لڑ کر جاتا ہے' بدقسمتی سے اگر مجسٹریٹ واقع ہوتا ہے'' تاں پھانسی دے دینداا ے بے گناہ نوں جا کے' غصہ کتھوں دا کڈھداا ے کتھے جا کے ❸''آپ دیکھئے گا! باہر کے معاملے میں جو لوگ چڑچڑے ہو جاتے ہیں' ان کا Balance (توازن) کہاں ہوتا۔ ان کے گھر کی زندگی کا مشاہدہ کیجیے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اذیت نا کی کا سرچشمہ

---

❶ اب کے ایک دفعہ تو نکل آؤں پھر تجھے گرا لوں گا۔ ❷ تو پھر چوراہے پہ دیکھو کہ اس گاڑی کا کیا حال ہوا ہوتا ہے۔

❸ تو بیگناہ کو پھانسی دے دیتا ہے۔ کہاں کا غصہ کہاں نکالتا ہے۔

بات نکلی کہاں جا کر؟ قرآن یہ کرتا ہے عزیزانِ من! کہ Balanced Personality (ایک اعتدال پہ قائم ذات' متوازن ذات) گھر کے اندر بناتا ہے اور وہ اسی صورت میں بن سکتی ہے کہ یہ جو دو زوج ہیں' گاڑی کو چلانے کے لیے ان کے اندر یکسانیت ہو' ہم آہنگی ہو' رفاقت ہو' احترام ہو' ایک دوسرے کے لیے تعظیم ہو۔ پھر دیکھئے! کہ آپ کے معاشرے کا نقشہ کیا بنتا ہے؟ کہا ہے کہ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ (2:231) ان عورتوں سے دوبارہ نکاح اس نیت سے نہ کرو کہ ان پر زیادتی کر کے انہیں تکلیف پہنچائی جائے۔ آہاہا! یہ قرآن ہے' عزیزانِ من! جو ایسا کرتا ہے اس نیت سے اس کو بیوی کو باندھ کے رکھتا ہے' بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ اس پہ ظلم کر رہا ہے۔ غور سے سنیے عزیزانِ من! قرآن ہے کہتا ہے کہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ (2:231) جو ایسا کرتا ہے بظاہر دل میں خوش ہوتا ہے کہ میں اس پہ ظلم کر رہا ہوں۔ کم بخت! اپنے آپ پہ ظلم کر رہا ہوتا ہے۔ واہ واہ واہ واہ کیا ہی خوب کہا!

عائلی زندگی میں قرآنی قوانین کا اتباع نوع انسانی کے لیے باعث سکون قلب ہیں:

دیکھا عزیزانِ من! قرآن کی عظمت کتنی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ (2:231) اپنے آپ پر ہی ظلم کر رہا ہے اور یہاں کہا ہے وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (2:231) دیکھنا! خدا کے قوانین کو مذاق نہ بنا لیا۔ یہ قوانین کیا ہیں؟ کہا کہ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (2:231) یہ جو تمہیں قوانین دے رہا ہے یہ خدا کی نعمت ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر دعا یہ مانگتے ہیں کہ راستہ ہم کو دکھا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ (1:7) ان کا راستہ دکھا جن پہ تو نے اپنا انعام کیا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ منعم علیہ' ہمارے ہاں تو پھر اس کے بعد ذہن میں وہی نقشے آتے ہیں کہ تقویٰ پرہیز گاری جو ہم نے اپنے ہاں تصور بنا رکھا ہے۔ کہتا ہوں قرآن سے آپ اگر نعمت خداوندی کی آیات اکٹھی کریں گے تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ کن کا راستہ دیکھنے کی آپ اُمیدیں اور آرزوئیں لے کر خدا کے حضور جاتے ہیں لیکن ہم تو نہ کوئی اُمید لے کر جاتے ہیں' نہ کوئی آرزو' بس چند الفاظ ہیں جو ہم نے زبانی یاد کر رکھے ہیں' وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اگر وہ امام صاحب پڑھ رہے ہوں ''تے اسی اوتھوں وی کھر کن ڈے ہونے آں [1]'' اور اگر پڑھ رہے ہوتے ہیں تو طوطے کی طرح دہرا رہے ہوتے ہیں ورنہ آپ سوچیے! کہ خدا کے حضور اتنی مرتبہ دن میں آرزو کر جاتے ہیں' رو بہ قبلہ ہو کر اس سے کہتے ہیں' ان کا راستہ دکھا جو منعم علیہ تھے اور یہاں کہا ہے کہ یہ جو عائلی زندگی کے متعلق ہم نے تمہیں قوانین دیے ہیں جن سے یہ زندگی خوشگوار بنے گی' یہ خدا کی نعمت تھی۔ ہم آرزو کرتے ہیں دل میں کھڑے ہو کر کہ یا اللہ! ان لوگوں کا راستہ دکھا جن کے گھر کی زندگی جنت کی زندگی ہے۔ دیکھا! آپ کے ہاں آرزوئیں کہاں آتی ہیں؟ کیا آرزو آپ لے کے جاتے ہیں؟ ان کی زندگی' ان کا راستہ دکھا جن کے گھروں کی جو زندگی ہے اس قسم کی جنت بدآماں فضاؤں کی زندگی ہے' جسے تو نے اپنی نعمت قرار دیا ہے۔

[1] تو ہم وہاں بھی خارش کر رہے ہوتے ہیں۔

گھریلو زندگی میں زوجہ کی حیثیت کی بجائے داروغے کا تصور حکمرانی کی ذہنیت پر مبنی ہے

عزیزانِ من! گھر میں خدا کی نعمت اس طرح سے آتی ہے اور جونہی آپ نے گھر کے اندر اس سے کہا کہ مرد داروغہ عورتوں کے اُوپر تو آپ سمجھ سکتے ہیں ''فیرتے اوتھانیدار تے حوالات دے قیدی دی زندگی ہے [1]'' بڑی نعمت خداوندی ہے صاحب! نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ (2:231) خدا نے قانون نافذ کیے۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم کا ایک اعجاز اور بھی ہے۔ ایک قانون ڈکٹیٹر دیتا ہے' ملوکیت کے قوانین کہ ایسا کرنا ہوگا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ کیوں کرنا ہوگا۔ ایسا کرنا ہوگا بس حکم حاکم مرگِ مفاجات' ہمارا حکم ہے ایسا کرنا ہوگا۔ اس کے اندر پوری محکومیت ہوتی ہے۔ ایک قانون ہوتا ہے جس قانون بننے سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے' کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں اس میں اصلاح کا تقاضا یہ ہے اس تقاضے کے لیے ہم نے کچھ پابندیاں تجویز کی ہیں۔ یہ پابندیاں دی جاتی ہیں اگر ان کے اُوپر عمل پیرا ہو گئے تو اس کے نتائج ایسے خوشگوار نکلیں گے۔ یہ جو ہوتا ہے کہ قانون سے پہلے اس قانون کا Objective دینا' یہ بتانا کہ یہ قانون کیوں نافذ کیا جا رہا ہے' The why of it (اس کی مصلحت کیا ہے' تقاضا کیا تھا) اس کے نتائج کیا نکلیں گے' اسے حکمت کہتے ہیں۔ اب یہ چیز ہو سکتی ہے کہ وہ صرف قانون دے' حکمت اس کی ہم خود وضع کر لیں۔ اس نے کہا کہ نہیں! اس میں دھوکا کھا جاؤ گے۔ ہم نے جب کہا ہے کہ اس قسم کی زندگی پیدا کرو تمہارے نتائج اچھے خوشگوار نکلیں گے' اب خوشگوار نتائج تو آپ خود اپنے ذہن میں بھی متعین کر سکتے ہیں کہ گھر میں صاحب! یہ روز آپ کے ہاں ہوتا ہے کہ صاحب! گھر چل ہی اس صورت میں سکتا ہے کہ گھر کے اندر ایک بادشاہ' ایک حاکم ہونا چاہیے۔ اب اگر آپ نے وہاں یہ ہنٹر کی جو زندگی ہے بسر کی' وہاں آپ نے ایک بادشاہ بنا لیا' ایک حاکم بنا لیا' ایک داروغہ بنا لیا اور اس کے بعد اپنے احکام کو آپ ڈنڈے کے زور سے منواتے چلے گئے' ٹھیک ہے بیوی بھی بڑی دبکی بیٹھی ہے' بچے بھی سہمے ہوئے ہیں یہ سب کچھ ہو رہے ہیں۔ اپنے ذہن میں آپ سمجھ رہے ہیں اور باہر بھی کہہ رہے ہیں کہ صاحب! جیسا ڈسپلن میرے ہاں ہے' میں نے کہیں کم دیکھا ہوگا' کسی کو جرأت نہیں ہے کہ سامنے سے چوں کر سکے۔ آپ نے خود متعین کر لیا کہ نتائج بڑے خوشگوار نکل رہے ہیں اور یہ اپنے ذہن سے نتائج کا متعین کرنا ہی تو ہے جہاں یہ آپ کے مذاہب مختلف اور اس کی شریعتیں مختلف اور اتنے قوانین مختلف ہیں۔ ہر شخص مطمئن ہوتا ہے کہ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) ہر گروہ مگن ہوتا ہے کہ ہم جس طریق پہ چل رہے ہیں بالکل صحیح ہے۔

قانون (ضابطۂ حیات)' نتائج اور حکمت کا تعلق:

قرآن کہتا ہے کہ صرف قانون کا دینا ہی ضروری نہیں ہوتا' یہ بتانا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ایسا کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ وہ نتیجے کو بھی متعین کر دیتا ہے۔ کیوں متعین کرتا ہے؟ تاکہ انسان فریب میں نہ رہے۔ اگر وہ نتیجہ نکلتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس قانون پہ عمل ہو رہا ہے اور اگر وہ نتیجہ نہیں نکل رہا تو پھر سمجھئے کہ ہم کہیں غلطی کر رہے ہیں۔ آپ کو کھڑے ہو کر دوبارہ سوچنا

[1] پھر تو وہ تھانیدار اور حوالات کی زندگی ہے۔

پڑے گا۔ ٹریفک سگنل کے مطابق چلو گے تو Accidents (حادثات) نہیں ہوں گے۔ یہ اس کی حکمت ہے۔ ٹریفک کے سگنل کے مطابق چلو یہ۔ کتاب ہے' Accidents نہیں ہوئے۔ یہ حکمت ہے۔ اگر اس کے باوجود Accidents (حاداث) ہوتے ہیں تو یہ قانون بنانے والے کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ کہیں کوئی Defect چیز رہ گئی ہے پھر اس میں وہ Improvement کرتے ہیں۔

کیا ہم نے صدیوں سے صلوٰۃ کے اجتماعی نظام کو عملی طور پر نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے؟

خدا نے جو قوانین دیے ہیں ان قوانین پہ عمل پیرا ہونے سے جو نتیجہ مرتب ہونا ہے اس نے خود ہی بتا دیا ہے کہ ایسا ہوگا تا کہ اپنے آپ کو فریب میں نہ رکھتے جاؤ۔ یہ کہا ہے کہ جو صلوٰۃ ہے یہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (29:45) صلوٰۃ' فحشا اور منکر سے روکے گی۔ صلوٰۃ' کتاب ہے۔ حکم' قانون ہے۔ حکمت' فحشا اور منکر سے روکے گی۔ ہر ایسی چیز جو معاشرہ کے اندر نامعقول ہو' Reason کو اپیل نہ کرے' بیہودگیاں پھیلائے' بخل پھیلائے' صلوٰۃ بس کو روکتی ہے۔ یاد رکھیے! منکر کے معنی عقل فریب کار کی حیلہ کاریاں ہوتی ہیں۔ یہ بتایا ہے کہ الصلوٰۃ یہ کرے گی۔ اب کچھ بھی آپ نام رکھ لیجیے' کوئی بھی چیز آپ کر لیجیے اگر وہ یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے تو وہ اُمت خدا کے مقرر کیے ہوئے صلوٰۃ کے اُوپر عمل پیرا ہے اور اگر آپ مطمئن ہیں کہ نماز بالکل صحیح ہوگئی اور یہ نتیجہ پیدا نہیں ہو رہا تو پھر تو دو میں سے ایک شکل ضرور ہوگی: یا تو یہ کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) خدا نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی صاحب! یہ صلوٰۃ اس کے ارکان کے ساتھ بالکل تادیباً پڑھی جا رہی ہے' پاؤں میں اتنا فاصلہ' ہاتھ وہاں تک اُٹھیں' رکوع میں یوں جاؤ تو یہ زاویہ بنے' سجدہ اس طرح سے ہو رہا ہے' یہ ساری اس کی جزئیات ٹھیک ٹھیک طے ہو رہی ہیں لیکن معاشرے کے اندر فحشا اور منکر سے نہیں روکا جاتا۔ تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا کہ یہ نتیجہ تو مرتب نہیں ہو رہا' کہیں غلطی ہو رہی ہے صاحب! اس کے بعد اس کو Continue تو کوئی نہیں کرے گا کھڑا ہو کر سوچے گا اور اگر ہم نے اس کا نتیجہ خود ہی ذہن میں مرتب کر لیا کہ اس سے انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے' ثواب ملتا ہے' آخرت میں نجات مل جائے گی تو معاملہ ختم ہے۔

ٹھیک ہے آپ نے دیکھا کہ کتاب کے ساتھ حکمت جو خود ہی قرآن نے دی ہے کتنی بڑی چیز ہے! یہ Pragmatic Test (استنتاجی ٹسٹ) ہے۔ اس کے جو نتائج ہیں' وہ ثابت کریں کہ حکم کے اوپر صحیح عمل ہو رہا ہے۔ اگر وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو حکم پہ عمل نہیں ہو رہا کیونکہ (معاذ اللہ) ہم یہ تو پھر نہیں کہیں گے کہ خدا نے یہ بات یونہی کہہ دی' ہم تو ٹھیک طریقے کے اُوپر صلوٰۃ ادا کرتے ہیں' نتائج یہ نہیں نکلتے تو پھر یہاں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے یونہی کہہ دیا ہے' ہمارا تو ایمان ہے: صلوٰۃ کتاب ہے' کتاب کے ساتھ قانون ہے قانون اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے اور حکمت اس قانون کی Why od it (اس کی وجہ جواز) ہے جو ہم فراموش کر چکے ہیں۔

صلوٰۃ کے نظام کو صرف نماز کی جذبات تک محدود کرنے کا نتیجہ

قرآن نے صلوٰۃ کی حکمت یہ بتائی ہے اتنا ہی نہیں کہ اس نے یہ چیز کہی بلکہ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ مصلین وہ بھی ہیں جو تکذیب دین کرتے ہیں۔ وہ جو یُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ (107:1) ہے اس میں فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ (107:4-5) ہے کہ مصلین یعنی وہ جو ہمارے ہاں کے فارم طریقے مقرر ہیں ان کے مطابق صلوٰۃ ادا کرے گا ورنہ وہ تو امام صاحب وہاں اس طرح صلوٰۃ نہیں ادا کرنے دیں گے۔ نماز پڑھ رہا ہے اس نے کہا ہے کہ مصلین کے لیے تباہی ہے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ (107:1) کبھی کبھی تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے کفر نہیں کرتا انکار نہیں کرتا عملاً جھٹلا رہا ہے۔ عملاً جھٹلانے کے کیا معنی ہیں؟ اللہ اکبر! کہہ رہا ہے کہ صلوٰۃ صحیح ادا کر رہا ہوں۔ خدا نے کہا تھا کہ یہ تنہا اور فحشا اور منکر سے روکے گی یہ نہیں روک رہی۔ یہ کیا کر رہا ہے؟ یہ خدا کے اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر رہا ہے۔ اللہ اکبر! اُف اُف اُف!! اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (107:1-3) دعویٰ کرے دین کا اسلام کا۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ کہ دین کو جھٹلا رہا ہے۔ کیا کر رہا ہے؟ یہ کہ جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے یہ اس کے ساتھ کھڑا ہونے کی اس کو بجائے دھکا دیتا ہے جو بھوکا سوتا ہے اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ (107:4-5) نمازیں پڑھتا ہے مطمئن ہو جاتا ہے کہ فریضہ خداوندی ادا ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تکذیب کرتا ہے۔ کرتا کیا ہے؟ یہ کہ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ (107:5-6) وہ تو یہ کرتا ہے جو لوگ دیکھ سکتے ہیں کہ ٹھیک ہے جی! نماز ہو گئی۔ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (107:7) جو کچھ نظر آتا ہے وہ کچھ تو ٹھیک ٹھیک کر کے چلا آتا ہے اور رزق کے ان وسیلوں کو جو چشموں کی طرح بہتے ہوئے ہر گھر کے سامنے سے گزرتے چلے جانے چاہئیں تھے یہ ان کو بند لگا کر روک کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ مصلین ہیں۔ یرآؤن ((107:6 والی چیز تو ان کی ساری صحیح ہے۔ کیا؟ تکذیب دین کرتا ہے میں پھر دہرا دوں کہ خدا نے جو کہا تھا کہ صلوٰۃ یہ نتائج پیدا کرے گی صلوٰۃ یہ نتائج نہیں پیدا کر رہی اس کا خدا کو کیا جاتا ہے (معاذ اللہ) جھوٹا ثابت کرتا ہے کہ یونہی کہہ دیا تھا کہ کرے گی۔ بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے کہ میں ہی صلوٰۃ پہ قایم نہیں ہوں وہ کہتا ہے کہ میری صلوٰۃ بالکل ٹھیک ہے مولوی صاحب فتویٰ دے دیتے ہیں کہ نماز ہو گئی۔ نماز ٹھیک ہو گئی نتیجہ یہ نہیں نکلتا۔ کبھی کہنے کے لیے یہ تو جرأت نہیں کرتا کہ میں ہی غلطی پہ تھا۔ برادرانِ عزیز! اس کا Logical Concluion (منطقی نتیجہ) یہ ہے کہ یہی چیز غلط ہے کہ وہ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ (107:1) دین کی تکذیب کرتا ہے۔ يَعِظُكُمْ بِهٖ (2:131) کتاب اور حکمت۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (2:231) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اچھی طرح سے سمجھ رکھو۔ یہی نہیں ہے کہ تم نے محسوس طور پر مرئی طور پر جو اس کی فارم اس کی شکل یہ اس کی جو چیزیں ہیں وہ ادا کر دیں اور سمجھ لیا کہ وہ چیز ہو گئی۔

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾ (2:23) ہر شے کا علم رکھتا ہے‘ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ صلوٰۃ یہ نتائج پیدا کرتی ہے یا نہیں۔

خدا تعالیٰ کی حاکمیت اور انسان کی ڈکٹیٹر شپ میں بنیادی فرق:

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے کتاب کے ساتھ حکمت کو منزل من اللہ کیوں کہا ہے؟ اور یہ چیز ہے کہ جو اسے قادرِ مطلق ہونے کے باوجود ڈکٹیٹر نہیں بنا رہی۔ ڈکٹیٹر کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ میں یہ حکم کیوں دے رہا ہوں‘ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا ہر حکم اس کے فادے کے لیے ہوتا ہے‘ وہ اپنے فائدے کے لیے دیتا ہے۔ یہ جو حکم دیتا ہے یہ تمہارے فائدے کے لیے دیتا ہے‘ اس لیے ساتھ بتاتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ڈاکٹر جو دوائی تجویز کرتا ہے‘ اس کے بعد آپ کو بتاتا ہے کہ بھئی! اگر تین مرتبہ یہ پیو گے اور یہ پڑا سا تھ کھاؤ گے تو اس کے بعد شام تک بخار اُتر جائے گا یا ہلکا تو ضرور ہو جائے گا۔ یہ اس کی حکمت ہے۔ شام کو اگر آپ دیکھتے ہیں‘ ٹمپریچر لیتے ہیں‘ بخار نہیں ٹوٹا ہلکا بھی نہیں ہوا تو آپ کو کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے‘ خود ڈاکٹر کو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا تشخیص غلط ہو گئی تھی‘ نسخہ غلط ہو گیا تھا‘ دوائی غلط ملی ہے‘ استعمال غلط ہوا ہے۔ وہ کیوں اس چیز پہ زور دیے چلا جا رہا ہے کہ کہیں غلط ہے؟ اس لیے کہ اس نے وہ نتیجہ پیدا نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے امراض کی تشخیص اس حاذق نے کی ہے جس سے بڑا کوئی طبیب نہیں ہو سکتا۔ نسخہ اس حکیم مطلق نے تجویز کیا ہے جس سے بہتر شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (10:57) کوئی نہیں ہے۔ یہ اس کا اعلان ہے یہ اس نے کیا ہوا ہے شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (16:69) کہا ہے قرآن کو۔ نسخ۔ اس نے تجویز کیا ہوا ہے لیکن

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبط دوا ہے اور میں ہوں

’’مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی‘‘ کی بنیادی وجہ غور و فکر کے عمل کو نظر انداز کرنا ہے:

بس یہ خبط دوا ہی ہے۔ بخار نہیں ٹوٹ رہا نہیں اُتر رہا تو نہ سہی۔ صاحب! یہ کیا ہے؟ یہ کہ یہ تقدیر میں ہی ایسا لکھا تھا۔ چل بھئی! معاملہ ختم ہوا۔ تقدیر صحیح ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں بھئی! تدبیر بھی تو خدا کی بتائی ہوئی تھی کہ جی تقدیر بھی تو خدا کی مقرر کی ہوئی ہے۔ ہمیں وہ تدبیر بتاتا ہے کہ بخار ٹوٹے گا اُدھر تقدیر لکھتا ہے‘ خود بخار سے کہتا ہے کہ مت ٹوٹنا۔ عزیزانِ من! کیا کر رہے ہیں ہم؟ کیا کر رہے ہیں؟ نہیں سوچو یہ کہ کیا نہیں کر رہے۔ کرنے کے لیے تو اس نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ (34:46) میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى (34:46) ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ میری بات سن لو‘ یہ کرنے کا کام ہے۔ پوچھا کہ کیا کہتے ہیں؟ ایک کام ہے‘ لمبا چوڑا پروگرام ہی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ (34:46) کھڑے ہو کر سوچا کرو کہ یہ نتیجہ کیوں نہیں نکلا۔ یہ ہے حکم۔

ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی حالت زار اور بیوہ کی اذیت ناکی کا پس منظر:

کیا ہے کہ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (2:231) وہ جانتا ہے کہ آگے کہا کہ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾ (2:232)۔طلاق یافتہ عورت جب عدت کی مدت کو پہنچ جائے تو پھر اسے اس بات سے نہ روکو کہ وہ جہاں کہیں نکاح کرنا چاہے اس کے راستے میں آپ روک بنیں۔

ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی حالت زار اور بیوہ کی اذیت ناکی کا پس منظر:

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں دو نکاحوں کے نکاح کے اُوپر کتنی شدت سے پابندیاں ہیں۔کل تک کی یہ بات ہے مطلقہ کے متعلق تو نکاح ثانی کا سوال ہی نہیں تھا یعنی کسی کے متعلق کہنا کہ وہ مطلق ہے تو وہ بیچاری جیسے منہ چھپائے پھر رہی ہے۔ پتہ نہیں اس سے کیا جرم عائد ہو گیا ہے۔ یہ تصور کیوں پیدا کیا؟ یہ تو وہی مرد کی حاکمیت ہے' داروغیت ہے جس نے یہ تصور پیدا کیا جیسے ایک دفعہ کا بے گناہ قیدی بھی اگر قید سے چھوٹ کر آ جاتا ہے تو پھر معاشرہ اس کو وہ عزت کا مقام نہیں دیتا۔ بے گناہ قیدی بھی قید کاٹ کر آیا ہے' بس۔ یہ چونکہ اس نے عورت کو قیدی' مجرم بنا کے اس داروغے اور حاکم نے رکھا تھا' اس نے کسی طرح سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیا ہے تو مرد نے یہ تصور قایم کیا ہے کہ یہ اب معاشرہ کے اندر عزت کی مستحق رہی نہیں ہے۔ باقی ساری عمر مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (17:18) دھتکاری ہوئی بیچاری ہے۔طلاق ہوئی ہوئی ہے آپ کو معلوم ہے یہ بات کس طرح سے کہی جاتی ہے؟ یہ کیا چیز؟ کہ اور ہر طرح سے بھی اگر اس کو یہ آسانی ہے کہ حاصل کر لے تو یہ بات کہ اس کے بعد معاشرے میں منہ کیا دکھاؤں گی' اس سے رُکی رہی۔ پتہ نہیں کہاں کہاں ہم چلے گئے۔کہا کہ دیکھئے! یہ بات نہ کہیں کہ پھر اگر یہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس راستے میں روڑے اٹکانے شروع کر دو۔ مطلقہ ہے' اجازت ہی نہیں اس کو دی جاتی اور بیوگان کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے' کل اس چیز کے لیے جہاد کرنا پڑا تھا کہ بیوہ عورتوں کی شادی ہونی چاہیے۔اس لیے کہ یہ تو یہاں کا ہمارے ہاں کا' یہ سارا معاشرہ ہندوانہ ہے۔ ہندوانہ معاشرہ میں مطلقہ تو ہوتی نہیں تھی' وہاں طلاق تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بیوہ ہو جاتی تھی' بیوہ کی شادی وہاں نہیں ہو سکتی تھی۔ان کے ہاں نہیں ہو سکتی تھی' ہمارے ہاں بھی کیوں ہو صاحب؟ بیوگان کی شادی کے خلاف بہت بڑا جہاد کرنا پڑا تھا' پھر کہیں آپ کے ہاں جا کر یہ بند ٹوٹا تھا اور بڑے بڑے ہمارے ہاں کے جو ارباب شریعت تھے' ان کے گھروں میں بھی یہ صورت تھی کہ وہ بیوگان کی شادی نہیں کرتے تھے۔قرآن نے کہا ہے کہ اس چیز کو نہ روکنا۔

قرآن حکیم کی طرف سے ملنے والے عائلی قوانین پر عمل پیرائی کا نتیجہ اور تزکیہ نفس کا مفہوم:

بات تو یہ دیکھئے کہ بظاہر چھوٹے چھوٹے عائلی زندگی کے متعلق قوانین ہیں جن کے متعلق گفتگو کی جا رہی ہے۔کہا کہ اس شخص کو ہم یہ نصیحت کر رہے ہیں جو خدا اور آخرت پہ ایمان رکھتا ہے۔ واہ! کتنی اہمیت حاصل ہو گئی ان قوانین کو! جو خدا اور

آخرت پہ ایمان رکھتا ہے اس کے لیے یہ قوانین ہیں اور پھر جوان قوانین کو مذاق بناتا ہے' اس کے بعد یہ دعویٰ کہ ہم خدا اور آخرت پہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اس کے لیے کہا جارہا ہے۔ اَزْکٰی لَکُمْ وَاَطْهَرُ (2:232) ہمارے ہاں تو ازکٰی کے معنی بھی پاکیزہ کیے جاتے ہیں اور اطہر کے معنی بہت زیادہ پاکیزہ۔ قرآن یہاں دو الفاظ لے آیا۔ ازکٰی کے معنی ہیں ''نشوونما''۔ عائلی زندگی کے متعلق قوانین دے رہا ہے اور کہا ہے کہ جوان کے مطابق یہ کچھ کرے گا اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی' زندگی بڑی پاکیزہ گزرے گی۔ اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے' وہ تو یہ ہے جسے تزکیہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو تزکیہ نفس بات ہی اور ہوتی ہے۔ یہ چیز ہے اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ باہر کے معاشرے کے اندر زندگی بڑی پاکیزہ گزر رہی ہے اور آپ جانتے ہیں پاکیزگی صرف یہی نہیں ہے کہ کپڑے اُجلے ہوتے ہیں' دھلے ہوئے ہوتے ہیں' نہایا دھویا ہوا ہوتا ہے۔ اگر یہ معیار ہو تو اس صورت میں تو ہمارے ہاں کا یہ سب سے بڑا طبقہ جس کی زندگی میں پاکیزگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا' سب سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے۔ جسے آپ Good Personality کہتے ہیں کا حامل شخص۔

لفظ Personality کا اور مظہر کا یقینی مفہوم

آپ کو پتہ ہے کہ آج کل ہمارے ہاں Personality (شخصیت) کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہ سجیلا نوجوان' سجتا دھجتا' Well Dressed شیوا چھا کیا ہوا' ویزلین کے ساتھ بال جمائے ہوئے' پالش بھی وہ جس میں چمک پیدا ہو رہی ہے' کریز بھی انتہائی اعلیٰ' ٹائی میچ کر رہی ہے۔ یہ جو ساری چیزیں ہیں' یہ ہیں جو آج سمجھی جاتی ہیں۔ یہ قرآن ہے اَزْکٰی لَکُمْ وَاَطْهَرُ کہا ہے اور پھر آگے کہا کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (2:232) یہ جو بظاہر میں نے باتیں کہی ہیں' یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اس سے آگے ایک اور معاملہ ہے' اسے تم نہیں جانتے' اسے ہم جانتے ہیں کہ ان چیزوں کی پابندی سے جو ایک انسان کے اندر صحیح انقلاب پیدا ہوتا ہے اسی کے مظاہرے کا نام پاکیزہ زندگی ہے پاکیزہ سیرت ہے۔ وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ قرآن کے لیے کہا ہے کہ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (56:79) یہ مس نہیں کر سکتے اس کو بجز ان کے جو مطہر ہوں۔ ہمارے ہاں تو وہ اتنی سی بات ہوئی کہ وہ پاک صاف ہو کر' غسل کر کے وضو کر کے قرآن کو چھونا چاہے یہ یوں معنی ہوئے یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ کہا کہ جس کے قلب و نگاہ کے اندر پاکیزگی نہیں ہے تو اس کو قرآن سے کچھ مس ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے اطہر یعنی قلبی اور ذہنی پاکیزگی' جن کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو' جو متوازن دل و دماغ کے مالک ہوں' جو اپنے ذہن کو تمام تعصّبات سے خالی کر کے اپنے دلوں کو تمام ذاتی رجحانات و میلانات سے منزہ رکھیں [1]۔

عورت کے لیے رضاعت اور نان و نفقہ کا مسئلہ:

برادرانِ عزیز! یہاں تک بات ہو گئی مطلقہ کے نکاح کی۔ اولاد ہے' چھوٹے بچے ہیں' ان کے دودھ پلانے کا مسلہ ہے' جسے رضاعت کہتے ہیں۔ کہا کہ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ

[1] ان نکات کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے' پرویز: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور 1961ء' ص: 1092 تا 1094

(2:233) دودھ پلانے کے لیے جسے آپ رضاعت کہتے ہیں‘ وہ قرآنِ کریم نے یہ کہیں حکم نہیں دیا کہ ہر ماں اپنے بچے کو کتنے عرصے تک دودھ پلائے۔ یہ تو بس ایک ہی چیز ہے کہ کتنی ضرورت ہے‘ کتنا پلا سکتی ہے‘ ایسی بھی صورت ہو سکتی ہے کہ ماں کے دودھ ہی اتنا نہیں ہے‘ فیڈنگ اتنی ہو نہیں سکتی یا بچہ ہضم نہیں کر سکتا۔ قرآن نے یہ متعین نہیں کیا۔ اگرچہ قرآن نے دو جگہ یہ بات کہی ہے عام طور پہ بچے کے متعلق کہا ہے کہ اس کے حمل کا اور دودھ پلانے کا وقفہ قریباً اڑھائی سال ہوتا ہے (46:15) یہ قرآن نے عام طور پہ ایک بات کہی ہے‘ یہ حکم نہیں ہے۔ دوسری جگہ دو سال کا بھی کہا ہے (31:14) یہ بھی حکم نہیں ہے۔

اب یہاں بچے کو دودھ پلانے کے متعلق قانون بات آ گئی۔ طلاق ہو گئی‘ دودھ پینے والا بچہ ہے۔ دیکھئے قرآن ہے۔ اس بچے کے حقوق کی حفاظت کا بھی اس کو خیال ہے۔ کہا ہے کہ والدہ اس بچے کو دو سال کے لیے دودھ پلائے اگر اس زمانے کو پورا کرنا ہے‘ اس کا ارادہ ہو تو۔ یہ چیز اب مجبوراً نہیں ہے‘ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس عورت کو قانوناً مجبور کیا جائے کہ تو ضرور اس بچے کو دودھ پلا۔ ہو سکتا ہے اس کے حالات اس کی اجازت نہ دیں‘ ہو سکتا ہے اس نے جہاں شادی کرنی ہے‘ وہاں یہ شرط عائد ہو جائے‘ اس کے راستے میں یہ چیز حائل ہو جائے اور قرآن میں جسے بچوں کی Guardianship (سرپرستی) کہتے ہیں‘ اس کے لیے بھی خود کوئی قانون نہیں دیا۔ وہ ایک فقرہ دیا ہے‘ میں آگے عرض کروں گا‘ جامع ہے کہ دو سال کے لیے کہاں بچے رہنے چاہئیں۔ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (2:233) جس کا یہ بچہ ہے‘ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مدت میں جب تک یہ دودھ پلانے کا معاملہ اس سے طے ہوا ہے‘ اس کے نان نفقے کی ذمہ داری اس کے اُوپر ہو گی یعنی کھانے پینے کی بھی اور پہننے کی بھی۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ (2:233)۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کتنا لینا چاہیے۔ خود نہیں مقرر کیا۔ قاعدہ کیا مضرر کیا؟ یہ کہ ایسی صورت جس میں اس کے اُوپر یہ چیز بوجھ نہ ہو‘ جیسے گھر کی زندگی کے اندر یہ اپنے بچوں کو پالتا تھا‘ اس بیوی کی ضروریات پوری کرتا تھا‘ بس اسی معیار کے مطابق یہ کچھ ہو گا۔

ازدواجی زندگی میں رضاعت کے لیے قرآنِ حکیم کی وسعتوں کا معیار بیٹھ کر خود طے کرو:

خدا یہ چاہتا ہی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے مقرر کر کے خوامخواہ تمہیں تکلف میں ڈال دے۔ شریعت کے اندر خدا کی مقرر کی ہوئی بڑی وسعتیں ہیں‘ عزیزانِ من! اصولی حدود کو تو وہ اتنا سختی سے رکھتا ہے کہ یہاں سے تم نے تجاوز کیا تو گئے جہنم میں۔ ان کے اندر بڑی وسعتیں رکھتا ہے تمہیں بڑی آزادیاں دیتا ہے۔ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ (2:233) یہ ہے جو وہ فقرہ۔ اصول یہ یاد رکھو! اگر تمہارے ہاں یہ انقطاع تعلقات کا ہوا ہے تو اب یہ نہ ہو کہ یہ بچے کی موجودگی یا ماں کو مصیبت میں ڈال دے یا باپ کو ایک مصیبت میں ڈال دے۔ بات بیٹھ کے طے کرو کہ کیا قانون ہونے چاہئیں صاحب! اصول یہ ہونا چاہیے کہ اس بچے کی موجودگی کی وجہ سے‘ نہ ماں کسی مصیبت میں پھنس جائے‘ نہ باپ کے گلے کے اندر یہ ایک مصیبت بن جائے۔ یہ طے کرو تم خود طے کرو۔

بچے کے باپ کی وفات کی صورت میں ورثا کی ذمہ داریاں اور رضاعت کا مسئلہ

اگر اس اثنا میں بچے کا باپ فوت ہو جائے تو پھر یہ ذمہ داری کس پہ پڑتی ہے؟ کہا ہے کہ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ (2:233) بچے کا باپ فوت ہو گیا ہے تو ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ لاوارث رہ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں وہ جو مرنے والے کے ورثا ہیں یہ ساری ذمہ داریاں ان پر منتقل ہو جائیں گی' وہ یہ کریں گے۔ تو کہا کہ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ (2:233) دو سال سے پہلے ہی' باہمی رضامندی سے اور مشاورت سے دیکھ لیجیے۔ طلاق شدہ یہ جوڑا ہے تعلقات ازدواجی منقطع ہو رہے ہیں' ایک معاملے کا فیصلہ کرنا ہے اس کو یہ کہتا ہے باہمی رضامندی سے باہمی مشاورت سے یہ چیز کی جائے۔ ہمارے ہاں تو مشاورت ان میں بھی نہیں ہوتی جن میں تعلقات چولی دامن کے ہوتے ہیں۔ یہاں ان میں مشاورت کرا رہا ہے جن میں اب تعلقات ہی باقی نہیں رہے ہوئے۔ کہا ہے کہ جو تعلقات تو معاہدے کے تھے' وہ فسخ ہوئے' تمہارے ہاں انسانیت کے تعلقات تو باقی ہیں' ان کو تو نہ چھوڑو۔ وَإِنْ أَرَدْتُّمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوٓا أَوْلَادَكُمْ (2:233) اور اگر یہ صورت ہو کہ یہ دودھ پلانا نہیں چاہتی اس کے ہاں دودھ نہیں ہے۔ کسی اور جگہ سے دودھ پلانے کا کوئی اور انتظام کرنا چاہتے ہو' فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (2:233) تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ إِذَا سَلَّمْتُم مَّآ اٰتَيْتُم بِالْمَعْرُوْفِ ۗ (2:233) بس اتنی سی بات ہے جو اس سے طے ہوا تھا' اس کو پورے کا پورا چکا دو' دوسری جگہ انتظام کر لو۔ کتنے صاف احکام ہیں' کتنے سہل احکام ہیں' جو دیے چلے جا رہے ہیں۔ کہا کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (2:233) بات یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنی ہے۔ یہاں فارم کا تعلق نہیں ہے' طریق کا سوال نہیں ہے۔ طریق جو بھی ایسا ہو' جس میں یہ مقصد پورا ہوتا ہو بس یہ کر دو۔ مقصد قانونِ خداوندی کی نگہداشت ہے۔

قانون کی پابندی کرنے کا تمام تر دارومدار اس بنیاد پر ہے کہ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق نتیجہ مل رہا ہے

اور بات آخر میں وہی ہے برادرانِ عزیز! جس بنیاد پر یہ قانون کی پابندی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾ (2:233) ہر وقت خیال یہ رہے' یہ نہیں کہ پولیس مین دیکھ رہا ہے یا نہیں' اس سے قانون کا احترام نہیں پیدا ہوتا۔

پاکستان کا وفد چین میں: یہاں چوری نہیں ہوتی لہٰذا تالا ہی نہیں ہوتا:

عزیزانِ من! ایمان یہ ہے کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ بس یہ ہے عزیزانِ من! مومن اور کافر کے اندر حد امتیاز یہ ہے۔ ورنہ پولیس مین (Policeman) کے ماتحت تو قانون کی پابندی کافروں کی قومیں ایسی کر رہی ہیں کہ اس پر ہم رشک کر رہے ہیں۔ ہمارے ہی ہاں کا وفد چین میں گیا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلنے لگا تو ان سے کہا کہ صاحب! تالا لگائیے۔ انہوں نے کہا کا ہے کے

لیے؟ کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں‘ اپنے کمرے میں تالا لگاؤں گا۔ کہنے لگے کاہے کے لیے؟ اب یہ بیچارے ’کاہے کے لیے‘ کیا سمجھیں۔ یہاں بھی کسی سے کسی نے پوچھا ہے کہ تالا کاہے کے لیے؟ اس نے کہا کہ صاحب! اندر میری چیزیں ہیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے پھر کیا ہوا۔ کہنے لگے: جی! وہ کہیں چوری نہ ہو جائے۔ کہنے لگے: آپ کہاں کی باتیں کر رہے ہیں‘ کس ملک میں آپ آئے ہوئے ہیں؟ ہمارے ملک میں تالا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں چوری نہیں ہے۔ یہ نہیں تھا کہ ہوٹل کے ہر دروازے کے اُوپر ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ پولیس والا بھی ناکام رہ گیا تھا فوجی کھڑا تھا‘ آج کل تو فوجی کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ سارے ملک میں سوائے مملکت کے امور کے جو بغاوت‘ سازشیں وغیرہ انتظام کے ہوتے ہیں پولیس ہی نہیں ہے۔ معاشرے کے انتظام کے لیے پولیس کی ضرورت نہیں پڑ رہی۔ وہ کہتا ہے کہ چوری نہیں ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے پوچھا کہ چوری کیوں نہیں ہوتی ہے؟

چوری کا عمل تو میری اور تیری کی تفریق سے پیدا کردہ ہوتا ہے

گھریلو زندگی میں چارپائی کی چوری کا کبھی تصور پیدا ہی نہیں ہوتا:

عزیزانِ من! میں کیا باتیں بتاؤں کہ وہاں چوری ہوتی کیوں نہیں ہے؟ فلاسفر نہیں ہے‘ یونہی ترجمان ہے وہ زبان جانتا ہے‘ کہتا ہے کہ وہ چوری ہوتی ہے کہ تمہاری جو چیز ہے وہ میں لے جاؤں‘ جہاں چیز کے متعلق یہ ہے ہی نہیں کہ وہ تیری ہے یا میری ہے تو چوری کیا۔ میرے اللہ! میں نے کہا تھا عزیزانِ من! کہ سپاہی کے کھڑے ہوتے ہوئے چوری نہ کرنا تو ایک طرف رہا سپاہی کی عدم موجودگی میں بھی چوری نہ کرنا۔ یہ چیزیں تو ان ملکوں نے بھی اپنے ہاں پیدا کر لی ہیں‘ جو خدا پہ بھی ایمان نہیں رکھتے آخرت پہ بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ہمارے ہاں کیا چیز اس نے بتائی تھی؟ وہاں بھی اگر آپ کر ید کر دیکھیں گے تو وہاں ان کے دل کے اندر بھی ایک آئیڈیالوجی ہوگی باطل ہی کی سہی۔ وہ بھی اپنے نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہ جو چیز تھی کہ صاحب! چوری تو وہاں ہوتی ہے کہ جو تمہاری چیز ہو‘ میں لے جاؤں۔ دیکھا آپ نے یہ اصول ہے۔ یہاں کیا اصول ہے جس کے لیے کسی پولیس مین کی ضرورت نہیں پڑتی‘ تالے کی ضرورت نہیں پڑتی؟ بڑی بات آسان ہے کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾ (2:233) اس چیز کا یقین رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو‘ وہ دیکھ رہا ہے۔ جو کر رہے ہو وہی نہیں دیکھ رہا‘ کہا کہ وہ تمہاری نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے۔ کہاں چلا گیا قرآن! وہاں تو پھر بھی جب نیت یا ارادہ عمل میں آئے تو اس کی گرفت ہوتی ہے۔ کتنی ہی Effeceint آپ کے ہاں جرم کی Detection کیوں نہ ہو۔ جرم کا جب محسوس طور پر ارتکاب ہو جائے اس صورت میں یہ ہے یا ایسا شبہ پڑ جائے کہ یہ کرے گا۔ دل میں اگر خیالات گزر رہے ہیں دن رات گزرتے چلے جائیں کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہو جس سے شبہ پڑے یا آپ ارتکابِ جرم نہ کریں گرفت نہیں ہوتی۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی وہ واقف ہے اور جو کچھ میرے دل میں گزر رہا ہے‘ وہ بھی Undetected نہیں رہ سکتا۔ کون پیش کرے گا؟ کہاں پیش کیا جائے گا؟ یہ تو جب آیات آئیں گی تو وہاں سورۃ بنی اسرائیل

میں بتاؤں گا' بات صاف سی کہہ دی ہے۔ پیش کیا مقدمہ' پہلے ہی دن ملزم نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! پولیس کی رپورٹ ہے' مجھے اس پہ اعتماد نہیں ہے۔ شہادت میں دوسرا آیا' نہیں صاحب! یہ جو گواہ ہے' یہ پھر گیا ہے' دوسروں سے مل گیا ہے۔ ہزار چیزیں ایسی نکلتی ہیں۔ وہ تو اس قسم کی ایک گنجائش ہے جو وہ چیخ [1] اُٹھا تھا کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

انسان کا اپنا نفس اپنی گواہی آپ ہوگا:

قرآن کہتا ہے کہ تمہارا آدمی نہیں' یہاں تو كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ (17:14) اس عدالت میں تو خود اپنے خلاف گواہی دے گا۔ کہا جائے گا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ (17:14) یہ ہے تیرا اعمال نامہ' پولیس کا کانسٹیبل یا ڈی ایس پی پراسیکیوشن نہیں کرے گا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ (17:14) اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ (17:14) تیری خلاف گواہی دینے والا تیرا اپنا نفس ہے۔ خود اپنے خلاف گواہی دے' اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ عزیزانِ من! پوچھا کرتے ہیں کہ صاحب ایمان کا کیا تعلق ہے؟ انسان اگر نیک عمل ہے ایمان پھر کہاں آتا ہے؟ وہ ٹھیک ہے ہمارا جو ایمان ہے وہ تو کہیں آتا نہیں ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ایمان کہاں آتا ہے؟ اس کا ایمان' ایمان ہے۔ یہ یقین کامل کہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی وہ واقف ہے اور یہ جو چیز سامنے آنی ہے' میں نے خود اپنے خلاف شہادت دے کر بیڑیاں پہن لینی ہیں۔ ایمان اسے کہتے ہیں اور یہی بنیاد ہے۔

انسانی معاشرے میں امن کا تصور ایمان کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا:

عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ تم ہمیشہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ آج یا آج سے دس ہزار سال بعد انسانی معاشرے میں امن اس دن قائم ہونا ہے جس دن یہ ایمان آجانا ہے کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ (2:233) خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل اور نیت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے نہ تو قانون کی رسمی پابندی کرو اور نہ ہی اس سے گریز کی راہیں تلاش کرو۔

عزیزانِ من! وقت ہوگیا' آیات یہی آگے چل رہی ہیں۔ آج ہم سورۃ بقرۃ کی آیت 233 تک آ گئے' 234 ویں آیت پھر آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

[1] یہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869) کی طرف اشارہ ہے۔

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزوں کا مقصود و منتہیٰ

(پرویز صاحبؒ کا ایک درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۃ بقرہ کی تین چار آیات (2:183-187) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (4:113)

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد' ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ

اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)۔ ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں''۔ یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝۱۸۳ (2:183) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۱۸۵ (2:185) اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)

تَتَّقُوْنَ۝۱۸۳ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تَشْكُرُوْنَ۝۱۸۵ سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃً الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ: وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط (10:78) ''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے''۔ اس

سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں، یارائے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾ (45:37) ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔'' دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ (43:84) ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار۔'' (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ: يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (الْمُدَّثِّرُ کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ''اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کردے''۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:1-2) ''اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا''۔ اور اس سے آگے ہے: وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111) ''لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو''۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: الْمُتَكَبِّرُ (59:23) کہا ہے۔ کہیں الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (13:9) اور کہیں: الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (22:62)۔ ہماری دنیا میں وہ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ: فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے مین اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)

جولوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ ونصیحت یا تقاریر وخطابات سے قائم نہیں ہوجاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ (9:40)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہوجائے اور خدا کا نظام جسے

غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہوجائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کردی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت ورفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں الْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:138) ''اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ وتسلط کے لئے قرآن کریم نے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط عائد کردی ہے۔ ''یعنی اگر تم مومن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کردیا کہ جولوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں، کافر ہیں لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4:141)۔

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلی میں نہیں۔ سبحن ربی الاعلی۔۔ الاعلی کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں، جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرمانیت ہے، مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط (7:146)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لتکبرو اللہ علی ما ھدٰ کم۔ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (2ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟۔۔۔ لتکبروا اللہ علی ما ھدٰ کم۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تا کہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (10:58)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ''تاکہ تم خدا کی بڑائی کرو''۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں' ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ و فغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں کرگسؔ کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر' دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو۔ ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' وَالْمَلٰٓئِكَةُ ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ۔ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (3:18) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔ یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

تصحیح

فروری 2024ء کے طلوعِ اسلام کے لمعات میں کچھ فروگذاشتوں کی طرف محترم شیخ اللہ دتا صاحب نے توجہ دلائی ہے جو کہ درجِ ذیل ہیں:

(1) پرویز علیہ الرحمہ کسی دور میں بھی ماہنامہ طلوعِ اسلام کے مدیر نہیں رہے۔ (2) قائداعظمؒ نے پرویز صاحب کو وزارت کی پیش کش نہیں کی تھی بلکہ کہا تھا کہ جو عہدہ آپ لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ (3) پرویز صاحب کا درسِ قرآن صرف جمعہ کو نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ ہفتہ وار تعطیل جس دن ہوتی اس دن منعقد ہوا کرتا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ

محشرستانِ فلسطین

(نوشتہ 1967ء)

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرات موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی، اوّل الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس بین حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر جنہیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (لہٰذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی اس خاک کا ذرّہ ذرّہ مقدس ہے کہ وہ عروج وزوالِ اقوام کی الٰہی مشیت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان وعمل کی بے نظیر تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان ہونے کے اس رشتۂ عزیز کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا اور اُسے جان سے عزیز تر رکھا، اب وہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتا ہے؟ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دونیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں۔ زندہ قوموں کا ہر مرحلہ ہوتا ہی فیصلہ کن ہے!

عرب:

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا عربوں کی تاریخ دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گم شدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ رابطہ قائم کرنے کے لئے ہم مختصراً تازہ ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دورِ حکومت میں عالمِ عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان کے بیداری کے آثار 1747ء سے شروع ہوتے ہیں جب اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جسے وہابی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث سمجھی یا سمجھائی جانے لگی تھی، اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات پیدا ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رُخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ 1875ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی

طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام، زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ قومی تغلب کے نشہ میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ 1860ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم، عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرقِ وسطیٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قویٰ کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ برصغیر پر قابض تھا، وہ انگلستان سے برصغیر تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحرِ روم اور بحرِ قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے 1882ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجیریا (1830) اور ٹیونس (1881ء) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرقِ وسطیٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحرِ روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگِ جان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے یہ سلسلہ جنگِ عالمگیر تک جاری رہا اور ممالکِ اسلامیہ استعمارِ فرنگ کا یا براہِ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیرِ اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بدنظمیوں اور مغربی قوائے کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی، مردِ بیمار بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافتِ اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالکِ اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی جذباتی تھی۔ لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف شکایات تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قویٰ مغرب کی باہمی رقابت تھی۔ آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا، اور 1914ء میں جنگِ عمومی کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریلیا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام یا ممالکِ عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں تک بھی تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدِ باب اشد ضروری تھا۔ کچنر کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فروری 1914ء میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ سے اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

عرب اور برطانیہ:

عرب، خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ حسین، شریفِ مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اُسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدتِ عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پر اُمید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچنر، سٹارس اور بعد میں سر ہنری میکموہن سے مصروفِ گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا، تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدۂ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس، حسین، فیصل سے متنفر بھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفسطار، الاحد جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے۔ کیونکہ وہ ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھا رہی

تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ موقع تھا کہ عالمِ عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیرِ اثر کیا جائے تا کہ انہیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جا سکے۔ ایسے میں رسوائے عالم میکموہن مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکموہن مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب، عراق، شرقِ اردن، فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکموہن نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حماد اور حلب کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ علاقے خالصتاً عربی نہ تھے۔ اس ''مغرب'' کی بعد میں یہ توجیہہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا۔ خود میکموہن نے ایک مرتبہ لندن ٹائمز میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکموہن نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آ جاتا تھا۔ اگر بغرضِ استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے ایسی دور از کار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے۔ میکموہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا، یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا، اس کی عرب آبادی نوے فیصدی تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدتِ عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا تھا۔ ایک حلقہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی ''استعمال'' کرتا___ قومیں جائیدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حقِ ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں اس متروک و مردود نظریہ کو اساسِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ طرزِ استدلال غمازی کر رہا تھا کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ابی سینیا پر اٹلی کا حقِ ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انہوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران عربی جذباتِ وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر 1917ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کاروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے۔ اور ترکی عساکر کا سلسلۂ رسد و رسائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عربی کی امداد ''بے بہا'' تھی۔ لائڈ چارج نے مواتمر امن (1919ء) میں اعتراف کیا:

> ''شاہِ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جس سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔''

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے کے لئے کیا کیا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے:

ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک، خریدنے میں صرف ہوگئی۔ حتیٰ کہ ان کی چھتوں کی ٹائلیں بھی بکنا شروع ہوگئی تھیں۔۔۔ (یہ حالت جولائی 1917ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک وشبہ سے مبرا ہے کہ جنگ کے دوران تین لاکھ شامی فاقوں سے مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے بیشتر نذرِ اجل ہوگئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئی۔ (The Arab Awakening)

عربی آزادی:

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی دعوتِ جہاد کی کیوں پروانہ کی؟ لارنسؔ کے الفاظ میں:

دورانِ جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں کی حکومت خراب تھی، بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھونکیں تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری، بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (لارنسؔ کے خطوط)

ترکوں کے دور نے عربوں میں بڑی حد تک جذباتِ قومیت وآزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہد ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرقِ وسطیٰ سے ان کو بے دخل کر دیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر مشرقِ وسطیٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لیے مشرقِ وسطیٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراخدلی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آراء کرنا تھا، اس لئے وعدوں کی معقولیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکتِ جنگ وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا، اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میکموہن نے اگست 1915ء میں حسین کو لکھا:

لارڈ کچنر نے جو اعلان علی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے جس میں ہماری ممالک عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

خفیہ معاہدہ:

مئی 1916ء میں جب عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا مغربی وفاق کے مؤید ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے معاہد ممالک عربیہ کو حلقہ ہائے اثر

(برطانوی اور فرانسیسی) میں تقسیم کرنے میں اتفاق کرلیا۔ اس معاہدہ کی رُو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے! معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس سے یکطرفہ معاہدہ کرلیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا تھا۔ اگر سائیکس، پکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمارِ فرنگ کی یہ بداخلاقی اور بددیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مسائل کی کہ ان میں سے اہم فلسطین ہے علت العلل ہے، روسی حکومت نے اسی خفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا۔ اور حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شر انگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزمِ مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت واستقلالِ عربیہ کی تشکیل وتقویم کرے گا۔ انگریز کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسینؓ کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی، جس کے جواب میں وزارتِ خارجہ (برطانیہ) نے (The Declaration to Seven) شائع کیا۔ اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

> جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خودمختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

7 نومبر 1917ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا:

> مشرقِ وسطیٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیشِ نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی (Complete and Final Liberation) ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں نیز ایسی قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب وفیصلہ کا نتیجہ ہوں گی برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظامِ حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ ایسی مؤثر امداد دیں گے جس سے وہ حکومتیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن موتمر امن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرقِ اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب ایک ''بدعت'' تھی جو جمعیتِ اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کی طرف سے مطالبہ ہوسکتا تھا، نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ خالص آزادی کا تھا جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق حسین کے بیٹے، فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرقِ اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو۔ شام، فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں۔ کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے

مطابق تھے جو جنگ کے دوران عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟ کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے متشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامرِ مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات وحسیات کو ٹھکرایا گیا جس کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے:

فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی۔ تاکہ وہ میسوپوٹیمیا حاصل کر سکے۔ س۔ پ ___ معاہدہ کی رُو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو حلب، حما، حمص، دمشق اور شرقِ اردن۔ انتداب، کے صدقے میں اکثر و بیشتر حصے انگلستان اور فرانس نے ہتھیا لئے۔ س۔ پ معاہدہ تحدید میں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حقِ مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔

اعلان بالفور:

برطانیہ کو چونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی، اس لئے اس نے ان سے رنگا رنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالم گیر جنگ میں، کہ جس کے سیاسی پسِ منظر کے ایک پہلو کو ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں مشرقِ وسطیٰ پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمنی کے وعدوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے گئے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنی طرف سے جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا، نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریکِ جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائزمین، صدر ذائنٹ ایسوسی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیا داں وائزمین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائزمین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ ان سب الجھنوں کا حل اعلانِ بالفور ہے جو 2 نومبر 1917ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا۔

ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کرے گی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انہیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔ اعلانِ بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رُو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب وغریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتامِ جنگ پر نوّے فی صدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی یہودی۔ لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر

یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت تھے۔ ایسی اقلیت کہ اسے ''غیر یہودی'' فرقہ، کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جاسکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں، عرب، کا لفظ تک نہیں۔ اور مدبرین وسیاستدان عربوں کی قسمت کا فیصلہ چکا رہے تھے۔ فلسطین کے اوّلین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض ومتمکن چلے آرہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل تھے۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فی صدی ہوسکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جاسکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال پیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کرسکے کہ اس مقصد ملک پر تسلط جماسکیں؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس لئے جرمنی کا ملک دیا جاسکتا ہے کہ ان کے آباؤاجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو بدیں وجہ بخشا جاسکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن اسلاف نے فتح کیا تھا؟

یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت:

بہرکیف اعلانِ بالفور نے ''قومی وطن'' کا وعدہ کیا، نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصہ میں یہودی حکومت قائم ہوجائے۔ ''قومی وطن'' ایک بالکل نئی اصطلاح تھی، لہٰذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعین کردیئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضحکہ خیز تصور پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانبین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہوگئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ دائز مین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی مملکت بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالفور نے زبانی اس مجذوب کی بڑ کی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین وقانون میں زبانی وعدے کوئی حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبطِ تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہوسکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشاء ورضامندی کے خلاف مسلط کئے جاسکتے ہیں؟

شاہِ فیصل نے اعلانِ مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے تحریر کیا:

بشرطیکہ عرب اپنی آزادی حاصل کرلیں۔۔۔ لیکن اگر معمولی کمی بیشی بھی ہوگئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ اعلان ساقط العمل، بیکار اور ناجائز ہوجائے گا۔ اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جواب دہ نہیں رہوں گا۔

یہ غیر مبہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے ہیں۔ اعلانِ بالفور عربوں کی آزادی میں منتج ہو تو قابلِ عمل ورنہ بے کار، ناجائز، ساقط العمل! اس اعلان نے یقیناً عربوں کی آزادی نہیں دلائی بلکہ انہیں اور پابندِ سلاسل کردیا۔۔۔ لہٰذا عرب اس کا ایک لفظ بھی ماننے پر مکلف نہیں۔۔۔ لہٰذا اعلان ساقط العمل! اب اسے اساسِ مذاکرات بنانا یعنی چہ!! اس کے بعد معاہدہ لوزان (1923ء) کی رُو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلان بالفور پر استوار تھی۔ (جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علامہ پرویز علیہ الرحمۃ کی آخری اپیل

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا، جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ:

1۔ اپنے ذہن میں کسی غیر قرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

2۔ اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرو کہ قرآن کی تعلیم انسان کو کس مقام پر لے جاتی ہے۔

3۔ قرآنی فکری نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو لیکن جو کچھ کرو خالصۃً لوجہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

4۔ آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

5۔ اپنے وقت اور توانائی کو، ضدی طبقے کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قرآنی تعلیم کو صرف اُن لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

6۔ ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ:

(1) دن بھر میں نے قرآنی احکام و تعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔

(2) آپ نے کسی دُکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔ یاد رکھیے! انسانیت کی بے لوث خدمت بلند ترین مقصدِ زندگی ہے۔

اور آپس میں پیار و محبت اور مُودّت و الفت کے ساتھ رہو، کہ دنیا میں قرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے

(والسلام)

(منزل بہ منزل، ص:181)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سپاسنامہ
بخدمت قائداعظم محمد علی جناحؒ
(23 مارچ 1940ء)

مارچ 1940ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں طلوعِ اسلام نے بھرپور شرکت کی۔ اپریل 1940ء کے شمارہ میں اس اجلاس کی روئیداد میں طلوعِ اسلام کے اُس سٹال کا ذکر بھی ملتا ہے جو اجلاس کے دوران لیگ کے پنڈال کے باہر نصب کیا گیا تھا۔ سٹال کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے مدیر طلوعِ اسلام لکھتے ہیں کہ ''سٹال سے ہمارا مقصد پمفلٹوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ کرم فرمایانِ طلوعِ اسلام سے ذاتی طور پر متعارف ہونا تھا اور شکرِ ایزدی کہ اس باب میں ہم فائز المرام واپس لوٹے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ہندوستان سے دُور دراز اور غیر معروف گوشوں کے لوگ آئے اور کوئی ایسا نہ تھا جو طلوعِ اسلام سے پہلے ہی واقف نہ ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا صدقہ ہے کہ جو اس مردِ مومنؒ کی دعاؤں کے طفیل ہمارے حال پر ارزاں ہوا جس کی یاد طلوعِ اسلام کا سرمایۂ زندگی ہے۔ ہمارے لئے یہ امر باعث صد مسرت تھا کہ جو حضرات وہاں تشریف لائے۔ ان کا ادارہ سے محض ایک رسالہ کے خریدار کا سا تعلق ہی نہ تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو ادارہ کا ایک جز سمجھتے تھے۔ ادارہ کے ساتھ ان کا رشتہ علمی کی بجائے یکسر قلبی تھا۔ سٹال پر ویسے بھی ہماری توقعات سے بڑھ چڑھ کر رونق رہی اور اس ہجوم میں ہمارے بعض احباب اگر ہمارا ہاتھ نہ بٹاتے تو ہمیں بڑی مشکل کا سامنا ہوتا۔ بعض کتابیں سٹال پر اتنی جلد ختم ہو گئیں کہ ایک کثیر تعداد حضرات کو مایوس لوٹنا پڑا۔''

یاد رہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا دفتر اُن دنوں دہلی میں تھا اور غلام احمد پرویزؒ بھی دہلی ہی میں مقیم تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے مذکورہ بالا اجلاس میں شرکت کے لئے نہ صرف یہ کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا وفد دہلی سے لاہور آیا بلکہ اپنی والہانہ محبت اور عقیدت کے پیشِ نظر ادارہ نے اس تقریب میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ ذیل میں تجدیدِ یادداشت کے لئے اُسے آج پھر سامنے لایا جا رہا ہے۔ (مدیر)

بہ شرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بیباکی و حریت۔ ضیغمِ نیستانِ جرأت و بسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست۔ پروانۂ شمعِ اخوّت و حمیت۔ طرۂ کلاہِ مُلک و ملت۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں۔ وقائدِ اعظمِ اسلامیان۔ محترم المقام جناب محمد علی جناح (مدظلہٗ العالی)

حریت نواز!

ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہوکر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے تحت خاموش ہوچکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا۔ سر پر منڈلانے والی شبِ تیرہ وتار کی ہیبت انگیزیوں کا پیامِ جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آرہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آرہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت وسیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں کہ دُور اُفقِ اُمید سے ایک شاہسوار رواں دواں اُمیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت وبربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت اُن راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز سے مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر اُڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور اُنہیں اپنے ساتھ بہالے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کرکے آرہی تھیں۔ غیر تو غیر، خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ ؎

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیاء پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُرنور تھیں۔ 21 اپریل 1938ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اِس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چُن لیا اور آپ کی نگاہِ دُوررس نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گردوپیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں جن میں کہیں ''متحدہ قومیت'' کے دامِ ہمرنگِ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہورہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال وپر کو غبار آلودۂ ارض وبوم بنا کر اُمتِ رسول ﷺ کافتہ لِناس کو جغرافیائی حدود کی آب وگل میں محبوس کیا جارہا تھا۔ کہیں ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠'' (42:38) کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخابات کے سراب کو آبِ حیواں بنا کر دکھایا جارہا تھا۔ کہیں اس ''اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ'' (4:59) مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت وقیادت کو عین دین قرار دیا جارہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف ''متحدہ محاذ'' کے طلسم سے کفار ومشرکین سے تولیٰ کے جواز کے فتاویٰ شائع ہورہے تھے۔

ایک طرف ایک مغنی آتش نفس سرودگاہِ واردھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندِ مکتب شاہین بچوں کے لئے، اہمسا کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں ''رام راج'' کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے ''شریفانہ معاہدے'' Gentleman Agreement استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور وغوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے 9 کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجر ہلال، جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجہ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی، اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار وتشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقت عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ ؎

آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

بطل جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جان گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان ''اپنوں'' کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشر گاہِ واردھا (Radio Station) کے آلات مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان ''مخلص منافقین'' کا ہے جن کی رفاقت وحمایت بیش ازیں نیست کہ ؎

کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام وبقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجہ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجومِ مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجود، تگ و دو حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہئے۔ جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے او رکسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال وظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں وہ آپ کی بلند نگہی اور حسنِ تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبداءِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پُرسوز و پُر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب ونظر اور عقل وعشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاعِ گراں بہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دِل نواز، جاں پُر سوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اُس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت وامارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور اُن کی خاطر آپ نے جو گرامی قدر قربانیاں کی ہیں، اُن کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے Constitutionally ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا، لیکن ہمیں اُمید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ وخدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے، یہ طوفانِ بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص ودیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ:

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ (11:43)

سید القوم! ادارۂ طلوعِ اسلام، جسے ہزار ہا پُرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے، اجلاسِ لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اُٹھ رہا ہے، قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جایئے۔ اس نصب العین کے اصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش وسر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن چوں پختہ شوی خودرا بر سلطنتِ جم زن

اراکینِ ادارہ طلوع اسلام، دہلی

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.77
ISSUE
3

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

